SOME ASPECTS OF
CHRISTIAN DOCTRINES

By
Allama Barakat Ullah

Fellow of the Royal Asiatic Society London

1952
Urdu
Feb.08.2006
www.muhammadanism.org

توضیح العقائد

دیباچہ

اس رسالہ کے مضامین گذشتہ پانچ سال کے دوران میں مختلف مسیحی رسائل میں (جن کے نام فہرست مضامین میں درج ہیں)شائع ہوچکے ہیں۔ اوراب احباب کی فرمائش پر کتابی صورت میں شائع کئے جاتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ خدا اس کتاب کو اپنے جلال کے لئے اورکلیسیا کی ترقی کے لئے استعمال کرے۔

برکت اللہ

۱۵ستمبر۱۹۵۱ء

انارکلی بٹالہ

فہرست مضامین

"میں ایمان رکھتا ہوں"

مسیحیت اورکلیسیائی عقائد نامے

مرحوم مولوی ثناءاللہ صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ مسیحیت میں کلیسیائی عقائد ناموں کو وہی بنیادی جگہ حاصل ہے جو اسلام میں کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو حاصل ہے۔پس وہ عقائد ناموں کےالفاظ پر بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی بے سود کوشش کرتے ہیں کہ " عقل ان کو غلط جان کرمردود قراردیتی ہے" (اسلام اورمسیحیت صفحہ ۶۱)۔ لہذا مسیحیت باطل ہے۔

اس مضمون میں ہم مولوی صاحب کے طرز استدلال اور منطقی قضایا کو فلسفیانہ محک پر نہیں پرکھنا چاہتے بلکہ ان کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مسیحیت میں مختلف عقائد ناموں کو جو مختلف اوقات میں وضع کئے گئے ہیں۔ کسی قسم کی بنیادی جگہ حاصل نہیں ۔ مسیحیت نہ تو ان کے الفاظ کوالہامی قراردیتی ہے اورنہ ان کو خطا سے منزہ مانتی ہے۔ اورنہ جمہورکلیسیائے جامع ان پر ایمان رکھتی ہے۔ پس اُن پر بحث کرنا سعی لا حاصل ہے اوران پر استدلال کی عمارت کھڑی کرنا تضیع اوقات ہے۔ اگرمولانا نے امرتسری چاہتے ہیں کہ ان کی بحث فائدہ مند ہو تو ان کو چاہیے کہ انجیل جلیل کے الفاظ کی بنیاد پر اپنا استد لال قائم کریں اورپھر ثابت کریں کہ " عقل ان کو مردود کردیتی ہے"۔ لیکن آپ یہ وطیرہ اختیارنہیں کرتے ۔ کیونکہ آپ تاقیامت انجیل جلیل کے الفاظ سے انجیلی عقائد کو " مردود" ثابت نہیں کرسکتے۔لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ فَاتَّقُواْ النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ(سورہ بقرہ آیت ۲۴)۔

(۲۔)

مولوی صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ کلیسیا کے دوران میں بیسیوں عقائدنامے وضع کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ہانس کی کتاب[1] میں تقریباً اڑھائی سورعقائدنامے یک جا جمع کئے گئے ہیں۔ ان عقائد ناموں میں سے تین عقائد نامے زیادہ مشہورہیں۔ ان کو بالترتیب عام طورپر رسولوں کا عقیدہ نیکاہ کا عقیدہ اوراتھانا سیس کا عقیدہ کہا جاتاہے۔ یہ نام

[1] Hans Bibliotheca der symbol

عوام نے مشہور کررکھے ہیں ورنہ" رسولوں کا عقیدہ" سیدنا مسیح کے مبارک رسولوں نے وضع نہیں کیا تھا۔ اورنہ" نیکایاہ کا عقیدہ" نیکایاہ کی کونسل نے جو ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی تھی، وضع کیا تھا اورآپ اپنے ہاتھوں اپنی لاعلمی کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ جب آپ فرماتے ہیں کہ" اتھاناسیس کا عقیدہ کونسل میں منظور کیا گیا" (صفحہ ۵۷) اتھاناسیس کا عقیدہ نہ تو مقدس اتھاناسیس نے وضع کیا اورنہ وہ نیکایاہ کی کونسل میں منظور ہوا تھا۔ رسولوں کا عقیدہ جو مغربی کلیسیا کی کتاب الصلوات میں ہے منجئ عالمین کے مقدس حواریوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ وہ ابتدائی صدیوں میں رُومی کلیسیا بُت پرست لوگوں کو بپتسمہ دینے سے پہلے مسیحی اُصولِ دین کی تعلیم سے واقف کرانے کےلئے استعمال کرتی تھی۔

نیکایاہ کا عقیدہ جو مغربی کلیسیا کی کتاب الصلوات میں پایا جاتاہے نیکایاہ کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء میں منظور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ قسطنطنیہ کی کونسل نے ۳۸۱ء میں منظور کیا تھا۔ اورکیلسیڈن کی کونسل نے ۴۵۱ء میں اس کو ازسر نومنظور کیا تھا۔ بعض علماء[1] کا خیال ہے کہ یہ عقیدہ ابتدائی صدیوں میں یروشلیم کی کلیسیا میں نومریدوں کو بپتسمہ سے پہلے مسیحی اُصول کی تعلیم دینے کےلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عقیدہ غالباً چوتھی صدی میں وضع کیا گیا تھا۔ اورابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس نے ۳۸۱ء میں اُس عقیدے کی جگہ کس طرح لے لی جو ۳۲۵ء میں نیکایاہ کی کونسل میں منظورکیا گیا تھا[2]۔

"اتھاناسیس کا عقیدہ" جو مغربی کلیسیا کی کتاب الصلوات میں ہے مقدس اتھاناسیس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا ۔ کیونکہ یہ بزرگ مشرقی کلیسیا کے تھے اور یونانی زبان میں لکھا کرتے تھے لیکن عقیدہ جواُن کے نام سے مشہورہے ۔ مغربی کلیسیا کی درحقیقت ایک نظم ہے ۔اس کا پایہ مرحوم حالی کے مسدس کا سا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور نظم کتاب الصلوات میں صبح کی نمازکے عنوان کے تحت ہے جس کو "الحمد" (Le Deum) کہتے ہیں ۔" مقدس اتھاناسیس کا عقیدہ" درحقیقت ایک گیت ہے جس کو اس

[1] e.g. Dr. Hort, Burns, Bethune, Baker etc.
[2] Hort's Two Dissertations

عقائد نامے کے شروع کی ہدایت کے بموجب مغربی کلیسیا خاص عیدوں اور تہواروں کے موقعہ پر" الحمد" کی طرح عبادت کے دوران میں گایا کرتی تھی ۔آٹھویں صدی میں اس گیت کو مقدس اتھاناسیس کی طرف منسوب کیا گیا ۔لیکن اس کااصلی نام (Quicunque) ہے جواس کا پہلا لاطینی لفظ ہے۔ یہ گیت مشرقی کلیسیاکی کتاب الصلوات کا حصہ نہیں ہے۔

پس گویہ عقائدنامے مغربی کلیسیا کی کتاب الصلوات میں پائے جاتے ہیں اوران کلیسیاؤں میں خاص اوقات پر پڑھے اورگائے جاتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مشرق ومغرب کی جمہورکلیسیائے جامع ان کے الفاظ کو ایسا بنیادی تصورکرتی ہے کہ وہ مسیحیت کی جان اورروح رواں خیال کئے جائیں یاکسی شاعر کی نظم کے الفا(خواہ وہ کیسا ہی متقی اور فاضل کیوں نہ ہو)کو اس قابل خیال کیا جاسکتا ہے کہ ان پر منطقیانہ استد لال قائم کیا جائے؟ خود مولوی ثناء اللہ صاحب آئے دن مسلمان شعراء کی مذہبی نظموں پر اخبار اہل حدیث میں لے دے کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان شعراء کے الفاظ ان کے زعم میں اسلامی حدود سے تجاوز کرجاتے ہیں۔ پھر نہ معلوم وہ "اتھاناسیس کے عقیدہ" کی نظم کے الفاظ کوکس منطق کی روسے فلسفیانہ استد لال کی بناقائم کرکے اپنی کتاب کے صفحے کالے کرگئے ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ سازکرے

حق تو یہ ہے مسیحی سوائے کلمتہ اللہ کے کلماتِ طیبات کے جوانجیل شریف میں پائے جاتے ہیں کسی شے کو خطا سے مبرا نہیں مانتے۔ پس وہ نہ توکلیسیا کو اورنہ کلیسیائی عقائد ناموں کو خطا سے بری مان سکتے ہیں تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کیا جائے کہ وہ الفاظ منجئی عالمین کے مقدس اقوال سے ثابت ہوسکتے ہیں۔ مغربی کلیسیا کی کتاب الصلوات تک میں یہ بات غیر مبہم الفاظ میں واضح بھی کردی گئی ہے۔(مسائل دین نمبر۸)۔

لیکن امرتسر کے مولوی فاضل صاحب کو تحقیق حق سے غرض ہوتی تو وہ ان باتوں کو معلوم کرنے کی زحمت گوارا کرتے ۔ اُن کو کیا معلوم کہ تمام مشرقی کلیسیا کی کتاب نہ صرف اتھاناسیس کے عقیدہ کی قائل نہیں بلکہ وہ نیکایاہ کے عقیدہ کو بھی اس صورت میں نہیں مانتی جو مغربی کلیسیا کی

کتاب الصلوات میں درج ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کے بعض الفاظ سیدنا مسیح کے کلماتِ طیبات سے ثابت نہیں ہوتے۔مولوی صاحب کو تویہ بھی پتہ نہیں کہ مسیحیت کے دائرہ میں بیسیوں کلیسیائیں ایسی ہیں جو ان عقائد کے نام تک سے ناآشنا ہیں۔

(۳۔)

معترض یہ سوال کرسکتاہے کہ ان عقائد ناموں کا وجود کیسے ہوا؟ جواب عرض ہے کہ کلیسیا کو ان عقائدناموں کے وضع کرنے کی ضرورت تب لاحق ہوئی جب کلیسیا میں مختلف ممالک کے علماء اورمختلف اقوام کے فضلاء اور فلاسفر ایک بڑی تعداد میں شامل ہوئے۔ قدرتی طورپر اُنہوں نے اپنے اپنے علم اور فلسفہ کے خیالات کے مطابق انجیل جلیل کے اُصول کو سمجھانا چاہا اور بعض شخصوں نے مسیحیت کے سمجھنے میں غلطی کی اوراس کج فہمی کی بدولت کلیسیا میں بدعتیں نمودار ہوگئیں۔ پس کلیسیائے جامع نے مختلف زمانوں میں کونسلوں کے ذریعہ ان بدعتوں کے عقائد کو درست کیا اورلوگوں کو صحیح عقیدہ بتلایا جو اُن کے خیال میں سیدنا مسیح اورانجیل جلیل کے الفاظ پر مبنی تھا۔ جب کوئی نئی بدعت ظہورپذیر ہوئی کلیسیائے جامع نے اس بدعت کا اُس زمانہ کے علم اور فلسفیانہ اصلاحات کے ذریعہ ایک عقائد نامہ وضع کرکے اس بدعت کا سدِباب کردیا۔ مثلاً جب ناستک بدعت پیداہوئی تو عقائد نامہ میں الفاظ" میں ایمان رکھتاہوں ایک خدا قادر مطلق باپ پر جوآسمان وزمین اورسب مرئی اورغیر مرئی چیزوں کا صانع ہے" ایزادکئے گئے۔ جب ایریس کی بدعت رونما ہوئی تو الفاظ "کل زمانوں سے پیشتر مولود، خدا سے خدا، نور سے نور، خدائے برحق سے خدا خدائے برحق ، مصنوع نہیں بلکہ مولود، اُس کا اورباپ کا ایک ہی جوہر ہے"۔ وضع کئے گئے علی ہذا القیاس عقائد نامے مختلف بدعتوں کے ساتھ جنگ کرنے کےلئے وضع کئے گئے تھے۔ اور وہ اِن جنگوں کی تاریخی یادگاریں ہیں اوربس۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عقائد نامے نہ توجامع ہیں اورنہ مانع ہیں یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ ان عقائد ناموں میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جومسیحی ایمان کے لئے لازمی اورلابدی ہیں اورکوئی ایسی بات ان میں سے نہیں رہ

گئی۔جونجات کےلئے ضروری ہو اورجس کا ان میں ذکر نہ ہو۔ان عقائد ناموں کا واحد مقصد صرف ان چند بدعتوں کا سدِ باب کرنا تھا۔جنہوں نے پہلی تین صدیوں میں کلیسیا میں سرنکالا تھا۔

(۴۔)

چونکہ ان عقائد ناموں کا مقصد بدعتی فلسفیانہ خیالات کا سدِباب کرنا تھا۔ لہذا اُس زمانہ کی کلیسیائے جامع نے انجیل جلیل کے الفاظ کی روشنی میں اُس وقت کے علم اورفلسفہ کی اصطلاحات کے ذریعہ ان بدعتوں کے فلسفیانہ اورسوفسطائی خیالات کی بطالت کو طشت ازبام کیا۔ لیکن ہر صاحبِ عقل پر یہ حقیقت روشن ہے کہ ہر زندہ زبان بدلتی رہتی ہے اورفلسفیانہ اصطلاحات کا مفہوم صدیوں بعد وہ نہیں رہتا جوکسی زمانہ میں ان اصطلاحات سے متعلق تھا۔ یہی حال ان عقائد ناموں کو فلسفیانہ اصطلاحات کے مفہوم کا ہے ۔ ان عقائد ناموں کی فلسفیانہ اصطلاحات بیسیویں صدی میں وہ معنی نہیں رکھتیں جوپہلی تین صدیوں میں ان سے اخذ کیا جاتا تھا۔بلکہ بعض اصطلاحات تو ایسی ہیں جن کے مطلب سے موجودہ زمانہ کے ہندوستانی مخالفینِ مسیحیت بے بہرہ ہیں۔ چہ جائیکہ عامتہ الناس ان کے صحیح معنوں سے واقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور کلیسیائے جامع ہر زمانہ خاص اصطلاحات سے استد لال نہیں کرتی رہی۔ بلکہ صرف سیدنا مسیح کے الفاظ کو ہی تمام زمانوں کےلئے قابلِ استناد سمجھتی رہی۔مثلاً الفاظ جوہر ،ذات ،اقنوم ،شخصیت وغیرہ جب خدا کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ۔ان اصطلاحات کے مطالب جوچوتھی صدی کے فسلفہ میں مروج تھے۔ وہ ان کے اُس مفہوم سے بالکل مختلف ہیں جوان الفاظ سے بیسویں صدی میں سمجھا جاتاہے۔چنانچہ مرحوم ولیم ٹمپل آرچ بشپ آف کنٹربری فرماتے ہیں کہ " بیسویں صدی کے لوگوں کو ان اصطلاحات کے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔کیونکہ چوتھی صدی کے خیالات بیسویں صدی کے خیالات سے کلیتہً مختلف ہیں۔ مثلاً انگریزی لفظ[1] (Person) کا وہ مفہوم نہیں جواس کے

[1] ان انگریزی یونانی اورلاطینی الفاظ کا ترجمہ اُردو میں جوہر،ذات،اقنوم،شخص وغیرہ کیا جاتا ہے۔

لاطینی اصل (Persona) کا ہے اوریونانی لفظ (Hypostasis) کا مفہوم اس انگریزی لفظ سے کلیتہ مختلف ہے ۔اگرہم ان دونوں لفظوں کو ہم معنی خیال کرینگے تو سخت گمراہی کے گڑھے میں گریں گے۔۔۔ بظاہر یہ یونانی لفظ لاطینی لفظ(Substatnia) کا مترادف ہے ۔ جس کا ترجمہ غلطی سے (Substance) کیا جاتاہے ۔۔۔حق تویہ ہے کہ بیسویں صدی کے لوگ اس شے کو مانتے ہی نہیں جس کو (Hypostasis) کا لفظ اداکرتا تھا۔ ان اصطلاحات کی بحث کو ان لوگوں کےلئے چھوڑدینا چاہیے جو آثارِقدیمہ اورباقیامتِ سلف دلچسپی رکھتے ہیں[1]۔

حق تویہ ہے کہ کسی علم اورفلسفہ کی اصطلاح کلمتہ اللہ کے مبارک الفاظ کے مفہوم کی رفعت اور وسعت کو کماحقہ بیان نہیں کرسکتی ۔ کیونکہ وہ بیان سے بالاتر اوربرتر ہے۔چنانچہ انطاکیہ کی کونسل میں (۲۶۸ء میں) الفاظ" اس کا اورباپ کا ایک ہی جوہر ہے"۔ قابلِ مواخذہ اورموردِ الزام سمجھے گئے تھے۔ ابتدائی کلیسیا کے اساقف اوربزرگ مسیحی حقائق کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کرنے کے خلاف تھے جوانجیل کے الفاظ نہیں تھے۔ کیونکہ انجیل کے الفاظ تمام زمانوں کےلئے مستند ہیں۔ لیکن علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات صرف ایک خاص زمانہ کے لئے ہی مفید رہبر ثابت ہوسکتی ہیں۔ اورانسانی زبان ابدی حقیقتوں کوظاہر کرنے میں قاصر رہتی ہے۔ اس بات کو عقائد ناموں کے حامی خود مانتے تھے۔ اگرچہ اُنہوں نے ان عقائد کے الفاظ کی خاطر سربکف ہوکر بے شمار اذیتوں کو برداشت کیا ۔مثلاً مقدس ہلیری(St. Hilary of Peitiers) جو ۳۵۰ء میں اسقف کے عہدہ پر ممتاز ہوئے فرماتے ہیں[2] " ایمان دارلوگ خدا کےکلام کو کافی خیال کرتے ہیں ۔ جس میں یہ حکم ہے کہ جاؤ اورتمام قوموں کو باپ ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔ لیکن ہمارے بدعتی مخالفین کا ناجائز رویہ ہم کو مجبورکرتاہے کہ ہم ایسی اونچائیاں چڑھیں۔ جورسائی سے باہر ہیں اوراُن باتوں کو الفاظ کی صورت میں پیش کریں جو الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتیں اوراس قسم کی جسارت کی

---

[1] Christus Veritas pp.136.137

[2] Ibid.Page.128 note.

جرات کریں حق تویہ ہے کہ ہم پر صرف یہ واجب ہے کہ ہم ایمان ہی کے وسیلے سے باپ کی پرستش کریں۔ بیٹے کی عزت کریں اورروح سے معمورہوجائیں ۔ لیکن اب یہ بدعتی علماءہم کو مجبورکرتے ہیں کہ ہم انسانی لغت جیسی بے بس شے کو ذریعہ ایسی باتوں کا ذکر کیں جس اس کی حد سے باہر ہیں اورایسے اُمور کوجن کا تعلق مذہبی مراقبہ کے ساتھ ہے (فلسفیانہ)الفاظ کے خطرہ اورجوکھم میں ڈالیں[1]۔

موجودہ زمانہ کے مسیحی متکلمین یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان قدیم اصطلاحات کے مفہوم کو دورِ حاضرہ کے خیالات اورفلسفہ کی اصطلاحات اورالفاظ میں پیش کریں۔ تاکہ ہمارے غیر مسیحی برادران ان ابدی سچائیوں کو سمجھ سکیں۔ جوان قدیم وجدید اصطلاحات میں مضمر ہیں۔ وہ ابتدائی مسیحی صدیوں کے خیالات اورفلسفہ سے نابلد ہیں لہذا ان کوچاہیے کہ وہ اپنے اعتراضات کو عقائد ناموں کے قدیم فلسفیانہ الفاظ پر قائم نہ کیا کریں۔ بلکہ ان پر واجب ہے کہ ان اصطلاحات کے سرچشمے یعنی انجیل جلیل کی آیات پر اپنے اعتراضات کو قائم کریں۔ کیونکہ صرف سیدنا مسیح کےکلماتِ طیبات ہی ہر مسیحی کےلئے حجت ہیں جن کے سامنے ہر مسیحی کا سرتسلیم خم ہے۔

"یسوع مسیح پر جو خدا کا اکلوتا بیٹا اورہمارا خداوند ہے وہ روح القدس کی قدرت سے پیٹ میں پڑا۔ کنواری مریم سے پیدا ہوا"

سیدنا مسیح کی پیدائش کی خصوصیت

مسیحیت کا ابتداہی سے یہ عقیدہ ہے کہ سیدنا مسیح خدا کا بے عدیل مظہر اور"دنیاکا منجی" ہے ۔ مسیحیت نے اپنی تاریخ کےکسی زمانہ میں بھی آنخداوند کو دیگر انبیاء اولیاء ،مصلحین یامرسلین کی قطار میں شمار نہ کیا۔ اُس کےکبھی وہم وگمان میں بھی نہ آیا کہ کلمتہ اللہ کو محض ایک رسول قراردے جس کی زندگی دیگر انبیاء کی زندگیوں سے بہتر تھی۔ اورجو انسانی کمزوریوں میں دیگر انسانوں سے کم مبتلا تھا۔ اورجس کا کام دیگر اقوام کے انبیاء اورمصلحین کی طرح یہودی قوم اورمذہب کی محض اصلاح کرنا تھا چنانچہ مورخ

[1] De Trin.ii.1.2

لیکی (Lecky) کہتاہے"مسیحیت نے عصبیت کے زور سے اپنے نظام کو جس قدرمضبوط اورمستحکم بنالیا تھا۔ یہ بات کسی اورمذہب کو نصیب نہ تھی۔مسیحیت کے اس انضباط وعصبیت سے اس کے حریف یکسر معرا تھے۔ اُس نے آتے ہی صاف صاف کہہ دیا۔ کہ اس کے سوادنیاکے تمام مذاہب باطل ہیں۔ نجات صرف اس کے پیروؤں کےلئے ہے۔اوربدنصیب ہیں وہ جواس کے حلقہ سے باہرہیں۔

انجیل جلیل میں کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ تمام مذاہب یکساں ہیں ۔ اورکہ مسیحیت دیگر مذاہب میں سے ایک مذہب ہے جس کا بانی دیگرمذاہب کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ اسکے برعکس انجیل کا ایک ایک صفحہ اس بات کا گواہ ہے کہ مسیحیت اوردیگرمذاہب کے درمیان بعدالمشرقین کا فرق ہے۔

(۲۔)

انجیل جلیل کا پہلا ورق ہی ہم کو بتلاتاہے کہ سیدنا مسیح کی پیدائش اوردیگرمذاہبِ عالم کے بانیوں کی پیدائش میں فرق ہے۔ جب سے انسان خلق کیا گیا۔ اُس وقت سے لے کر دورِحاضرہ تک کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان ہوا ہو۔ سیدنا مسیح کی طرح باکرہ کےبطنِ اطہر سے" خدا تعالیٰ کی قدرت" سے پیدا نہیں ہوا(متی ۱: ۲۰۔ لوقا ۱: ۳۴تا ۳۵)۔ اورقیامات پیدا نہ ہوگا۔ اس قسم کی پیدائش صرف کلمتہ اللہ کی ذات سے ہی مخصوص ہے اوریہ خصوصیت ایسی ہے جس کو موالف ومخالف دونوں تسلیم کرتے ہیں چنانچہ قرآن نہایت شدومد کے ساتھ اس حقیقت کا اقرار کرتاہے (آل عمران ۴۰تا۴۲۔ مائدہ ۱۰۹، مریم ۱۶تا ۳۲وغیرہ)۔ قرآن خوارق عادت پیدائش کی وجہ سے مسیح کوکلمتہ اللہ اورروح اللہ کہتاہے اوریہ ایک ایسی بات ہے جوقرآن کے مطابق خاص مسیح کی ذات سے ہی متعلق ہے۔ اورکسی دوسرے شخص پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن قیم جوزی "خدا کی طرف روح کی اضافت" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں " اب دوامرباقی رہ گئے۔ اوّل کہ اگرکوئی شخص یہ کہے کہ اگر فرشتہ نے مریم میں نفخ کیا تھا۔ جس طرح دیگرانسانوں میں نفخ کرتاہے۔ تومسیح کو روح اللہ کیوں کہا گیا۔ جب تمام ارواح اسی فرشتہ کے نفخ سے حادث

ہوتی ہیں ۔تو مسیح کی اس میں کیا خصوصیت رہی؟ دوم یہ کہ کیا حضرت آدم میں بھی اسی فرشتہ نے روح پھونکی تھی۔ یاخود خدا نے جس طرح آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اُسی طرح اُسمیں روح بھی پھونکی تھی؟ حقیقت میں یہ دونوں سوال قابلِ غورہیں۔ امراوّل کا جواب یہ ہے کہ" جس روح کو مریم کی طرف نفخ کیاگیا۔ یہ وہی روح ہے جوخدا کی طرف مضاف ہے۔ اورجس کوخدا نے اپنے نفس کے لئے مخصوص کیاہے۔اوریہ تمام ارواح میں ایک خاص روح ہے۔ یہ روح وہ فرشتہ نہیں ہے جو خدا کی طرف سے ماں کے پیٹ میں مومن اورکافر کے بچوں میں روح پھونکتا ہے ۔ بلکہ یہ روح جومریم میں نفخ کی گئی وہ خاص روح ہے جس کو خدا نے اپنی ذات کےلئے مخصوص کیاہے"(کتاب الروح مطبوعہ دائرہ المعارف صفحہ ۲۲۷)۔

کلاہ خسروی وتاج شاہی ہرکس کے رسد حاشا وکلا

پس کلمتہ اللہ کی بے نظیرپیدائش آپ کی خصوصیت ہے اور یہ روئے زمین کے کسی دوسرے انسان کو نصیب نہیں۔

رینان جیسا آزاد خیال اور عقل پرست یہ کہنے پر مجبورہوجاتا ہے کہ" مسیح کی ذات نوعِ انسانی کی حقیقی فلاح کی مضبوط پُشت وپناہ ہے۔اگر اس دنیا سے مسیح کا نام مٹ جائے تودنیا کی بنیادیں کھوکھلی ہوجائینگی۔وہ ایسی بے نظیرہستی ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کی باگ ڈور ہے اورجس کے ذریعہ انسان خدا کے پاس پہنچ سکتا ہے ۔ نوعِ انسانی کےلئے اس کی زندگی ایک زبردست نمونہ ہے۔ اگر وہ ہمارے سینوں میں مسکن گزین نہیں ہوتا توہم کو حقیقی راستبازی اورپاکیزگی حاصل نہیں ہوسکتی"۔

کلمتہ اللہ کی شخصیت ہی ایک ایسی واحد شخصیت ہے جس کی تعلیم اورنمونہ ہے۔ اگر وہ ہمارے سینوں میں مسکن گزین نہیں ہوتا تو ہم کو حقیقی راستبازی اورپاکیزگی حاصل نہیں ہوسکتی"۔

کلمتہ اللہ کی شخصیت ہی ایک ایسی واحد شخصیت ہے جس کی تعلیم اور نمونہ کوہر زمانہ ملک اور قوم کے کروڑوں افراد اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں مشرق اور مغرب شمال اورجنوب سب کا سرآپ کی ذات کے سامنے

جھکا ہوا ہے۔ سیدنا مسیح اکیلا واحد مشرقی شخص ہے جس کے سامنے اہلِ مغرب اوراہلِ مشرق سب کے سب سربسجود ہیں۔ ابن اللہ کی ذات کامل ہے آپ کی صفات جامع ہیں اورآپ کا نمونہ کل بنی نوع انسان کےلئے کامل اوراکمل ہے۔ بقول مولانا روم۔

دربشر روپوش کردہ است آفتاب

فہم کن اللہ اعلم بالصواب

صورتش برخاک وجاں برلا مکاں

لامکانے فوق وہم سالکاں

کنواری مریم سے پیدا ہوا

مقدس لوقا انجیل نویس فرماتے ہیں جوباتیں آپ نے اپنی انجیل میں لکھی ہیں" اُن سب کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کرکے" آپ نے ترتیب واراُن کو تحریر کیا ہے۔ پس آپ نے سیدنا مسیح کی معجزانہ پیدائش کا واقعہ جوانجیل مرقس میں نہ تھا" ٹھیک ٹھیک دریافت کرکے" لکھا ہے آپ کے دیباچے کے الفاظ اس بات کی گارنٹی ہیں کہ آپ گواہوں کی شہادت کی چھان بین اورجانچ پڑتال کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ آپ کے نزدیک ہر شے کی تہ کو پہنچنا بڑی اہمیت رکھتا تھا۔آپ یہ نہایت ضروری امر سمجھتے تھے کہ ہر امر شروع سے دریافت کیا جائے اوراُس کی صحت معلوم کی جائے تاکہ کسی قسم کے شبہ وشک کی گنجائش نہ رہے۔

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مقدس لوقا کی انجیل کے پہلے دوباب کی زبان اورطرزتحریر سے ثابت ہے کہ اُن کا سرچشمہ ایک عبرانی تحریر تھی۔ ان ابواب کی زبان اوردیگر ابواب کی زبان میں بین فرق ہے ۔دیباچے کی چارآیات اعلیٰ قسم کی یونانی میں لکھی ہیں۔ لیکن ان آیات کے بعد کی زبان یونانی ماخذ عبرانی کا ترجمہ ہے۔ یہ بات اردو ترجمے تک میں ظاہر ہے۔ پہلی چارآیات ایک ہی طویل مرکب جملے پر مشتمل ہیں لیکن پانچویں آیت سے سادہ عبرانی بیان شروع ہوجاتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے اورمختصر فقرے ہیں جو حرف عطف" اور" سے پیوستہ ہیں۔ یہ طرزتحریر مقدس لوقا کی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل نویس مذکورکسی عبرانی ماخذ کا یونانی زبان میں ترجمہ کررہے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے کا مقدس بی بی مریم بتولہ کو" بشارت"

دینے کا واقعہ انجیل لوقا کی تالیف سے بہت پہلے عبرانی زبان میں بہ شکل تحریر کلیسیا میں موجود اورمروج تھا۔ ہم اس تحریری ماخذ کے احاطہ تحریر میں آنے کا ٹھیک وقت یقینی طورپر متعین نہیں کرسکتے۔ ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان دوابتدائی ابواب کے نفس مضمون کا مطالعہ یہ ظاہر کردیتاہے کہ یہ بیانات اپنی موجودہ شکل میں منجئی جہان کے مصلوب ہونے کے بعد نہیں لکھے جاسکتے تھے۔کیونکہ ان ابواب میں اسرائیل کے بحال ہونےاورخدا کے وعدوں کے پورا ہونے کا جن الفاظ میں ذکرکیا گیا ہے وہ اُس صورت میں پورے نہیں ہوئے تھے جس کی یہود کو تمنا تھی۔ ان تمناؤں اوراُمیدوں پر کلمتہ اللہ کی تعلیم اور روئیے سے پانی پھر گیا۔ اوران ہیں وجوہ کے باعث صلیب کا واقعہ رونما ہوا۔ اگریہ بات واقعہ صلیب کے بعد لکھی جاتی توہم ان ابواب میں یہودی تمناؤں،امنگوں اورآرزوں کی خوشی کی جھلک نہ ملتی، جواب ان ابواب میں جھلکتی نظرآتی ہے۔

(۲۔)

ان ابواب کے سرسری مطالعے سے ظاہر ہے کہ منجئی عالمین کی پیدائش کا واقعہ مقدسہ مریم کے نقطہ نگاہ سے لکھا گیاہے۔ صدیقہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کا بتانے والا نہیں ہوسکتا ۔ پہلے پہلے حضرت بی بی صاحبہ نے " یہ سب باتیں اپنے دل میں رکھیں"(۲: ۵۱) لیکن معلوم ہوتاہے کہ منجئی جہان کی صلیبی موت کے جانکاہ واقعے نے صدیقہ کی " جان کو ایسا چھیدا" (۲: ۳۵) کہ وہ جانبر نہ ہوسکیں اور تھوڑے عرصے کے بعد اس دارِفانی سے کوچ کرگئیں۔ کیونکہ روح القدس کے نزول کے بعد آپ کے مبارک نام کا انجیلی مجموعہ میں ذکرنہیں آتا ۔ اپنی حین حیات میں مقدسہ" ان سب باتوں کو اپنے دل میں رکھ ان پر غورکیا کرتی تھیں"(۲: ۱۹) ان معنی خیزواقعات کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کرآپ نے آنخداوند کی وفات سے پہلے ان کا ذکراُن عورتوں سے کیاہوگا جوآپ کی ہمرازاورآپ کے بیٹے کی غم گسارتھیں۔(لوقا ۱: ۳۹، ۸: ۳۔ اعمال ۱: ۱۵ وغیرہ)۔ اوریوں یہ رازاحاطہ تحریر میں

آگیا ہوگا۔ تاکہ روح القدس کی زیر ہدایت کلیسیا ان اہم واقعات کے گہرے مفہوم کو سمجھ سکے۔

(۳۔)

مقدس متی رسول نے بھی اپنی انجیل کے آغاز میں منجئی عالمین کی اعجازی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے۔ دونوں انجیل نویس اس بات پر متفق ہیں کہ آنخداوند کی پیدائش ایک پاک کنواری کے بطن سے ہوئی۔ ان دونوں کے بیان میں تفاوت اور فرق ہے لیکن تضاد نہیں۔ یہ تفاوت قدرتی ہے کیونکہ مقدس لوقا مقدسہ مریم صدیقہ کی نقطہ نگاہ کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن مقدس متی کے بیان کا سطحی مطالعہ یہ ظاہر کردیتا ہے کہ وہ حضرت یوسف کے نقطہ نگاہ سے لکھا گیا ہے اوراس دنیا میں صرف یہی دوش خص ہوسکتے تھے جن کو آنخداوند کی اعجازی پیدائش کا حقیقی علم ہو سکتا تھا۔ انجیل اوّل میں حضرت یوسف کا بیان ہے ، حضرت کی پریشانی اورتذبذب کی حالت اورطلاق دینے وغیرہ کا خیال ،یہ سب ظاہر کرتے ہیں کہ یہ حیران کنُ اُمورحضرت یوسف کے ذہن میں تھے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف آنخداوند کی جوانی کے ایام میں وفات پاچکے تھے۔ پس آپ نے وفات سے پہلے کسی رازداردوست کو بتایا ہوگا جس سے یہ حال مقدس متی نے حاصل کیا۔

(۴۔)

جب ہم مقدس لوقا اورمقدس متی کے بیانات پر بنظر تعمق نگاہ کرتے ہیں توہم دیکھتے ہیں کہ مقدس لوقا کے بیان کا مقدس متی کے بیان پرکسی قسم کا اثرنہیں اورنہ انجیل اوّل کا بیان انجیل سوم کے بیان پر اثر انداز ہے دونوں بیانات ایک دوسرے سے غیر متعلق ہیں۔ دونو کی حیثیت اُن گواہوں کی سی ہے جو آزاد ہیں اورجنہوں نے مل کر کوئی افسانہ یا من گھڑت بات نہیں بنائی۔ پس دونوں کی متفقہ شہادت آنخداوند کی معجزانہ پیدائش کی نہایت مضبوط اور زبردست دلیل ہے۔

(۵۔)

مقدس مرقس کی انجیل میں منجئی عالمین کی پیدائش کا ذکر نہیں پایا جاتالیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ آنخداوند کی اعجازی پیدائش کے قائل نہ تھے۔ انجیل مرقس کے لکھنے کا مقصد" سب باتوں کا سلسلہ شروع سے" مرتب کرنا نہ تھا۔ بلکہ مقدس مرقس کا مقصد یہ تھا کہ مسیحی نومریدوں کے ہاتھوں میں ایک ایسی مختصر کتاب ہوجس میں حضرت کلمتہ اللہ کے چند معجزات اوربالخصوص منجئی عالمین کی زندگی کے آخری ہفتے کا تفصیلی ذکر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ آنخداوند کی سہ سالہ خدمت کا ذکر بیس صفحوں میں کرتے ہیں۔ لیکن آخری ہفتے کا ذکر سولہ صفحوں میں ایسی باریک تفصیل سے کرتے ہیں کہ وہ ڈائری یاروزنامچہ معلوم ہوتا ہے ۔ اسی لئے بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ انجیل درحقیقت صلیبی واقعہ کا بیان ہے جس میں پہلے بیس صفحوں کا ایک طویل دیباچہ ہے۔

چونکہ اس انجیل کا شروع آنخداوند کے بپتسمہ سے ہوتا ہے لہذا اس میں آپ کی پیدائش کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ پس مرقس کی انجیل کی خاموشی سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے کہ انجیل نویس کو منجئی جہان کی اعجازی پیدائش کا علم نہ تھا یا وہ اُس کے قائل نہ تھے۔ اس کے برعکس یہ ایک معنی خیز نکتہ ہے کہ جہاں مقدس متی لکھتے ہیں" کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں"(۱۳: ۵۵) وہاں مقدس مرقس حضرت یوسف کی طرف اپنی تمام انجیل میں اشارہ تک نہیں کرتے اوراس مقام پر لکھتے ہیں "کیا یہ وہی بڑھئی نہیں جو مریم کا بیٹا ہے؟(۶: ۳)۔

(۶۔)

مقدس یوحنا کی انجیل مقدس متی رسول کی انجیل کے بعد لکھی گئی۔ جب ہم انجیل چہارم کا پہلی تین اناجیل سے مقابلہ کرتے ہیں توہم دیکھتے ہیں کہ مقدس یوحنا بعض جگہ ان کی ترتیب کی اصلاح کرتے ہیں۔ مثلاً مرقس ۱۴: ۱۲، متی ۲۶: ۱۷، لوقا ۲۲: ۷ کی ترتیب کی اصلاح اپنی انجیل کے ذریعے کرتے ہیں(۱۳: ۱) اگر مقدس یوحناانجیل اول یا انجیل سوم کے بیان یا دونوں بیانوں کو غلط خیال فرماتے تو ضرورآپ اس بیان کی بھی اصلاح کرتے۔ لہذاآپ کی معنی خیزخاموشی ان بیانات پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے اوراُس سے ثابت

ہوتا ہے کہ آپ آنخداوند کی مافوق العادت پیدائش کے یقیناً قائل تھے۔ع

خموشی معنی دارد کہ درگفتن نمی آید

اس سلسلے میں ایک اورنکتہ بھی قابل غور ہے۔ انجیل چہارم کا مقصد مسئلہ تجسم کو ثابت کرنا تھا اورآنخداوند کی معجزانہ پیدائش اس اہم اوروسیع موضوع کی ایک شاخ تھی۔ جولوگ آنخداوند کے تجسم کے قائل تھے وہ آپ کی مافوق الفطرت پیدائش کے بھی قائل تھے اورتجسم کے منکر معجزانہ پیدائش کے بھی منکر تھے۔ پس جب انجیل نویس فرماتا ہے کہ "کلام مجسم ہوا اورفضل اورسچائی سے معمورہوکر ہمارے درمیان رہا اورہم نے اُس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال" توظاہر ہے کہ تجسم کے اقرارمیں اعجازی پیدائش کا اقراربھی شامل ہے۔کیونکہ یہ دونوں لازم وملزوم سمجھے جاتے تھے۔

مقدس یوحنا اپنی انجیل کے دیباچے میں فرماتے ہیں" وہ نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے ، نہ انسان کے ارادے سے بلکہ خدا سے پیداہوئے"(۱: ۱۳)۔ اس آیت کی ایک اور قرات ہے جس کو جسٹن شہید، بشپ آئرینوس، ٹرٹولین اورہپولیٹس استعمال کرتے ہیں۔ اورجس میں فعل بجائے جمع ہونے کے واحد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہواکہ اس آیہ شریفہ میں اشارہ مومنین اورمومنات کی طرف نہیں بلکہ آنخداوند کی طرف ہے۔ اورآیت یوں ہے"وہ (کلمتہ اللہ) نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے ، نہ انسان کے ارادے سے بلکہ خدا سے پیدا ہوا"اگریہ قرات صحیح ہے تو مقدس یوحنا منجئی عالمین کے مقدسہ مریم کنواری کے بطن سے پیداہونے کا ذکرنہایت واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔

لیکن اگریہ قرات صحیح نہ بھی مانی جائے توبھی یہ سوال پیداہوتا ہے کہ انجیل نویس الفاظ" نہ انسان کے ارادے سے" استعمال کرکے کیوں اُن کو خدا کے فرزندوں کی پیدائش کا نمونہ قراردیتا ہے ؟چونکہ وہ ان الفاظ سے مومنین کی روحانی پیدائش کو(جو قوانینِ فطرت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی)ایک نمونہ قراردیتا ہے لہذا یہ ظاہر ہے کہ اس کے ذہن میں حضرت کلمتہ اللہ کی معجزانہ پیدائش کا تصورموجود ہے۔اورانجیل نویس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح منجئی

عالمین اس دنیا میں مافوق الفطرت طورپر پیدا ہوئے اوراسی طرح مومنین اورمومنات جو خدا کے فرزند ہیں ایک مافوق الفطرت عالم میں روحانی طورپر پیدا ہوتے ہیں۔

پس اناجیل اربعہ صراحتہً یاکنایتہً منجئی جہان کی اعجازی پیدائش کا اقرارکرتی ہیں اوراس کوایک تاریخی واقعہ تسلیم کرتی ہیں جوفی الحقیقت ساڑھے انیس سوسال ہوئے زمان ومکان کی قیود کے اندر سے اُس دنیا میں رونما ہوا۔انجیلی بیان کی اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ یہ بیان کسی انسان کی قوتِ متخیلہ کا مرہون احساس نہیں ہے ۔بلکہ اس کی بنیاد حقیقت کی چٹان پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو اس عمارت پر صدیوں سے مخالفین کی تنقید کی آندھیاں چلیں اورکفر کے سیلاب کی باڑھیں آئیں لیکن یہ گھر نہ گرا۔ کیونکہ اس کی بنیاد تاریخ کی محکم چٹان پر ہے۔

"اس نے پنطوس پلاطوس کے عہد میں دکھ اٹھایا مصلوب ہوا۔ مرگیا۔ اوردفن ہوا"؟

کیا خدا مصلوب کیا گیا تھا؟

مرزا صاحب قادیانی (غفراللہ ذنوبہ) باربار اپنی کتاوں میں لکھتے ہیں کہ" عیسائیوں کا خدا مردہ ہے"۔ مولوی ثناءاللہ مرحوم بھی آنجہانی مرزا جی کے اس کذب وافترا کے مصدق ہیں۔اورخیال فرماتے ہیں کہ مسیحیت کے مطابق خدا نعوذ باللہ مصلوب کیا گیا تھا(اسلام اورمسیحیت صفحہ ٦٦ وصفحہ ١١٠وغیرہ)۔لیکن نہ توہمارے سودیشی نبی کے الہام اورٹیچی ٹیچی فرشتہ نے اورنہ ان کے امرتسری مولوی فاضل مصدق کے مفروضہ علم وفضل نے ان کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ اس قسم کی لغویات کولکھنے سے پہلے مسیحی عقائد سے کم ازکم سطحی واقفیت ہی حاصل کرلیں۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ انجیل جلیل اورجمہور کلیسیائے جامع نے اس قسم کی لغویات جو اُن کی کتابوں کی زینت ہیں صدیوں سے بدعت قراردے رکھا ہے"۔

امرتسری مولوی صاحب کو " مقدس اتھاناسیس کا عقیدہ" بہت مرغوب ہے۔ اگرچہ وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کو کس نے اورکب مرتب کیا تھا۔ (صفحہ ۵۷) اگر وہ اسی عقیدہ کا بغور مطالعہ کرلیتے تو وہ اس لغزش سے بچ جاتے ۔چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ" عقیدہ جامعہ یہ ہے کہ ہم تثلیث ہیں خدائے واحد کی اورتوحید میں تثلیث کی پرستش کریں نہ اقانیم کو محفوظ کریں اورنہ جوہر ذات تقسیم کریں ۔کیونکہ باپ کی اقنومیت اور ہے۔ ابن کی اور ہے اورروح القدس کی اور ہے"۔ پس مسیحی عقیدہ تینوں اقانیم میں تمیز کرکے باپ اوربیٹے میں فرق کرتا ہے۔ اورایک اقنوم کو دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ کیونکہ باپ کا روپ اورہے بیٹے کا روپ اورلیکن آنجہانی مرزائے قادیانی اوران کے مصدق مولانائے امرتسری" اقانیم کو مخلوط" کرکے کہتے ہیں کہ خدا مصلوب کیا گیا۔جو مسیحی تعلیم نہیں اورجس کو مسیحیت ہمیشہ کفر قرار دیتی چلی آئی ہے۔ مولوی ثناء اللہ اقانیم کی مخلوط کرتے ہیں کیونکہ وہ " رکن" لیتے ہیں۔(صفحہ ۶۲)اورکبھی اس سے مراد" جزو" لیتے ہیں (صفحہ ۶۳) اوریہ نہیں جانتے کہ انجیل جلیل اورمسیحی عقائد کے مطابق یہ معنی نہ صرف ناجائز ہیں بلکہ مردود ہیں۔

مولوی ثناء اللہ صاحب اس مکروہ حرکت کا ارتکاب اس لئے کرتے ہیں کہ وہ بزعم خویش اپنی پیش کردہ قرآنی آیات کی تائید کریں(صفحہ ۶۳)۔ جن میں لکھا ہے لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَآلُواْ إِنَّ اللّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ "بیشک وہ لوگ حق سے منکر ہوچکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح ابن مریم ہے(مائدہ ۱۷)۔لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُواْ إِنَّ اللّهَ ثَالِثُ ثَلاَثَةٍ "بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے ایک ہے(مائدہ آیت ۷۳)۔ لیکن جناب مولوی صاحب کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ یہ آیات صحیح مسیحی عقائد الوہیت مسیح اور تثلیث کے خلاف ہیں بلکہ ان بدعتی کافروں کے خلاف ہیں جن پرجمہورکلیسیا نے نزول قرآن سے صدیوں پہلے کفر کافتویٰ لگایا ہوا تھا۔کیونکہ وہ حضرت مولانا کی طرح " اقانیم بدعتی عیسائیوں کو(اورمولوی ثناء اللہ صاحب کوبھی) پچھلی اوراگلی آیات میں تنبیہ کرکے کہا ہے" اہل کتاب تم کچھ راہ پر نہیں ہوجب تک کہ تم توریت اورانجیل پر قائم نہ

ہوجاؤ۔۔۔سوائے ایک معبود کے اورکوئی معبود نہیں ہے تم اپنے دین میں ناروازیادتی نہ کرو۔ اوراُن لوگوں کے خیالات کو نہ مانو جوگمراہ ہوگئے اوربہتوں کو بہکاگئے۔اورآپ سیدھی راہ سے بھٹک گئے"(مائدہ ع ۱۴)۔ ان سطور سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن توحید فی تثلیث کی تعلیم دیتا ہے بلکہ وہ ان آیات میں لوگوں کو چند بدعتوں کے خلاف آگاہ کرتا ہے گووہ خود ایک اورقسم کی غلطی میں پڑگیا ہے کیونکہ الوہیتِ مسیح اورتثلیث کے بارے میں قرآنی تعلیم بعینہ ائریئس (Arius) کی تعلیم دیتا ہے جس کوکلیسیائے جامع نے بدعت قراردے دیا تھا۔

جمہورکلیسیائے جامع کا صحیح عقیدہ یہ ہے" میں خدا قادرمطلق باپ پر ایمان رکھتاہوں۔۔۔ اوریسوع مسیح پر جواُس کا ابنِ وحید اورہمارا خداوند ہے وہ مجسم ہوا۔ اورانسان بنا ۔ مصلوب ہوا۔ مرگیا تیسرے دن جی اٹھا"۔ (رسولوں کا عقیدہ اورنیکایاہ کا عقیدہ)ان عقائدناموں میں باپ اوربیٹے میں تفریق وتمیزکی گئی ہے"خدا قادرِمطلق باپ" مصلوب نہیں ہوا۔ بلکہ"یسوع مسیح جواُس کا ابنِ وحید ہے مصلوب ہوا"۔ باپ بیٹا نہیں اور بیٹا باپ نہیں ہے۔ دونواقانیم میں امتیازکیا گیا ہے" اقانیم مخلوط نہیں کئے گئے اورنہ جوہر ذات تقسیم کیا گیا ہے۔ باپ کا روپ جدا ہے بیٹے کا روپ الگ ہے ۔ پس صحیح مسیحی ایمان کے مطابق خدا باپ مصلوب نہیں ہوا۔ بلکہ ابنِ وحید یسوع مسیح جوانسان بناوہ مصلوب ہوا۔

جیسا ہم ذکر کرچکے ہیں تاریخِ کلیسیا میں ایسے نادان لوگ پیدا ہوئے جو اقانیم کو مخلوط کرکے یہ تعلیم دیتے تھے کہ خدا قادرِمطلق باپ ہمارے گناہوں کی خاطر مصلوب ہوا۔ایسے لوگوں کی تعلیم کو جمہورکلیسیائے جامع نے کفر قراردیا۔ اس کفر آمیزتعلیم کو لاطینی میں " پیٹرپیس ان[1]" اور یونانی میں " تھیوپس کی شئن" کہتے ہیں ا س تعلیم کا بانی پریکسی اس تھا۔

انجیل جلیل کی ہر کتاب میں خدا باپ اوربیٹے میں ہر جگہ تمیز وتفریق کی گئی ہے۔ چنانچہ مقدس پولوس رسول فرماتا ہے " اگرچہ آسمان وزمین میں بہت سے خدا کہلاتے

[1] Patripassion Theopaschilian Prexeas

ہیں لیکن ہمارے نزدیک توایک ہی خدا ہے یعنی باپ اورایک ہی خداوند ہے یعنی یسوع مسیح"(۱کرنتھیوں ۵:۶)۔ یہی وجہ ہے کہ انجیل جلیل میں خدا باپ کےلئے لفظ"ہوتھیوس[1] (بمعنی خدا)آیا ہے لیکن ابن اللہ کےلئے لفظ"کیوری اوس" (بمعنی آقا یا خداوند)آیا ہے۔ سیدنا مسیح کےلئے صفت کے طورپر ایک جگہ "تھیوس" (بمعنی الہٰی) آیا ہے(یوحنا ۱:۱) لیکن وہاں بھی " ہوتھیوس" نہیں آیا کیونکہ یہ لفظ صرف خدا باپ کےلئے مخصوص ہے۔ چنانچہ بشپ ویسٹکٹ صاحب اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ " اگرہم کہیں کہ کلام" ہوتھیوس"تھا تو ہم سبلین (Sabellian) بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قرآن بھی اسی بدعت کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ یہ کہتا ہے " بے شک وہ لوگ حق سے منکر ہوچکے ہیں جویہ کہتے ہیں کہ ابن اللہ عین مسیح ابنِ مریم ہے"(مائدہ ۷۶)۔

امید ہے کہ ہمارے غیر مسیحی برادران اب سمجھ گئے ہوں گے ۔ ہم کٹر موحد ہیں ہم اب اورابن میں تمیزکرکے یہ نہیں کہتے کہ خدا مصلوب کیا گیا ہے نہ ہم کسی مصلوب خدا پر ایمان رکھتے ہیں اورنہ ہمارا خدا مردہ ہے۔ بلکہ ہم ایمان رکھتے ہیں " ایک قادرِمطلق باپ اورایک خداوند یسوع مسیح پر جو خدا کااکلوتا بیٹاہے۔ وہ ہم آدمیوں کےلئے اورہماری نجات کے واسطے آسمان پر سے اترآیا اورپنطوس پلاطوس کے عہد میں ہمارے لئے مصلوب ہوا۔ وہ مارا گیا اوردفن ہوا۔ اورتیسرے روز پاک نوشتوں کے بموجب جی اٹھا۔

خداکا برّہ

"دیکھویہ خداکا برّہ ہے جو دنیاکا گناہ اٹھا لے جاتاہے"(یوحنا ۱:۲۹)۔

بعض مخالفینِ انجیل یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا الفاظ مقدس یوحنا اصطباغی کی زبان سے نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ آپ کی منادی کے الفاظ جوانجیلِ اوّل کے تیسرے باب میں تفصیل کے ساتھ مندرج ہیں ، مندرجہ بالا فقرے کے الفاظ کے ساتھ منطبق نہیں ہوسکتے۔ مزید برآں اس فقرہ کےالفاظ سیدنا مسیح کےکفارہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں

[1] Oqeos Kuplos Qeos.

لیکن بارہ رسولوں کی سمجھ میں کفارہ کی تعلیم ابن اللہ کی ظفریاب قیامت کے بعد آئی تھی(لوقا ۲۴: ۲۱، ۲۶)۔ لیکن یہ اعتراض درحقیقت بے بنیاد ہے۔ جب ہم اناجیل ثلاثہ میں مقدس یوحنا اصطباغی کی منادی کے الفاظ کو غوراور تدبر کے ساتھ پڑھتے ہیں ۔ توہم پر واضح ہوجاتاہے کہ انجیل چہارم کی منادی کے الفاظ اوربالخصوص یہ آیہ شریفہ اس منادی کے بصیرت افروزمضمون کے عین مطابق ہے۔

(۱۔)

سب مخالف وموالف اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس آیہ شریفہ کے الفاظ کا حوالہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے ۵۳باب کی طرف ہے۔ جس میں خدا کےخادم کے مشن کی حقیقت ۔ اُس کی آمد کی علتِ غائی اورمقصد کا ذکر ہے یسعیاہ نبی کی کتاب کے دوسرے حصہ (ازباب ۴۰تا ۵۵) میں اس مقصد کے موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اوراس موضوع کا ۶۱باب میں بھی ذکر ہے جس کی ابتدائی آیات کا اطلاق حضرت کلمتہ اللہ نے اپنے اوپر کیا تھا(لوقا ۴: ۱۶تاآخر) کیونکہ ان آیات میں خدا کے خادم کا حقیقی مطمع نظر واضح کیا گیا ہے۔ چاروں اناجیل اس بات کی شاہد ہیں کہ مقدس یوحنا اصطباغی نے صحیفہ یسعیاہ کے دوسرے حصہ کی آیات کا اطلاق اپنے اُوپر کیا تھا(یسعیاہ ۴۰: ۳۔ متی ۳: ۳ مرقس ۱: ۲لوقا ۳: ۴ یوحنا ۱: ۲۳)اُس کے خیال میں اس کی آمدکا حقیقی مقصد یسعیاہ ۴۰: ۳ میں مضمر تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اُس نے یسعیاہ کے صحیفہ کے دوسرے حصہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ اوراُس کے موضوع سے کماحقہ ، واقف تھا جو" خدا کے خادم" کے تصورسے متعلق ہے۔

چاروں انجیلوں کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ مقدس یوحنا اصطباغی اپنے آپ کو ایک ایسے"آنے والے" کا پیشتر وسمجھتا تھاجو" مجھ" سے زورآور ہے۔ میں اُس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں۔وہ روح القدس اورآگ سے بپتسمہ دیگا" اس کی منادی کے الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے خیال میں" وہ شخص جومیرے بعدآتاہے۔ اورجومجھ سے مقدم ٹھہرا" درحقیقت وہی" خدا کا خادم ہے"۔ جس کاذکر صحیفہ یسعیاہ میں آتاہے۔ اس ایک بات پر حضرت ابن اللہ اور مقدس یوحنا اصطباغی دونوں متفق ہیں۔ چنانچہ آنخداوند

مقدس یوحنا کی نسبت فرماتے ہیں ۔کہ" یہ وہی ہے جس کی بابت لکھا ہے کہ دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں۔ جو تیری راہ تیرے آگے تیار کریگا"۔ (متی ۱۱: ۱۰) حضرت ابن اللہ اور مقدس یوحنا اصطباغی دونوں اس امر سے کماحقہ، واقف تھے۔ کہ آنخداوند ہی درحقیقت " وہ خدا کا خادم" ہیں جس کا ذکر صحیفہ یسعیاہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مقدس یوحنا نے"پچھوایا بھیجا کہ آنے والا توہی ہےیا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں" توآپ نے جواب دیا "جوکچھ تم سنتے اوردیکھتے ہو۔ جاکر یوحنا سے بیان کردوکہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے پھرتے ہیں۔ کوڑھی پاک صاف کئے جاتے ہیں۔ اوربہرے سنتے ہیں اورمرُدے زندہ کئے جاتے ہیں۔اورغریبوں کو خوشخبری سنائی جاتی ہے اورمبارک وہ ہے جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے "(متی ۱۱: ۲تا ۶)۔ اوراس کو ثابت کرنے کےلئے آپ نے " اسی گھڑی بہتوں کو بیماریوں اورآفتوں اور برُی روحوں سے نجات بخشی اوربہت سے اندھوں کو بینائی عطا کی "(لوقا ۷: ۲۱)تاکہ آپ مقدس یوحناکو(جوبیم ورجا اورتذبذب کی حالت میں قید خانہ میں پڑا تھا)"خدا کے خادم " اصلی مشن ومقصد دوبارہ یاددلائیں جوصحیفہ مذکور میں موجود ہے۔کہ" تواندھوں کی آنکھیں کھولے"(۴۲: ۷) " اُس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کےلئے بھیجا ۔کہ اندھوں کوبینائی پانے کی خوشخبری سناؤں۔ کچلے ہوؤں کو آزاد کروں"(۲۱: ۱۔ لوقا ۴: ۱۸)۔ تب لنگڑے ہرن کی مانند چوکڑیاں بھرینگے اورگونگے کی زبان گائیگی "(۳۵: ۶)۔ اوربیماروں کو شفا بخش کرآپ نے مقدس یوحنا کو کہلوابھیجا"۔مبارک وہ ہے جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے"۔اس اشارہ سے درحقیقت آپ کا منشاء یہ تھا کہ مقدس اصطباغی حضرت یسعیاہ ۵۲: ۱۴ اور۵۳: ۳ پر دوبارہ غورکریں۔پس ظاہر ہے کہ گو سیدنا مسیح کے شاگرد مولا کے مشن کو کماحقہ آپ کی ظفریاب قیامت کے بعد ہی سمجھ تھے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ رازمقدس یوحنا اصطباغی سے بھی پوشیدہ تھا۔ رسول آپ کی طرح مسیح موعود کے پیشرو نہیں تھے اورنہ اُنہوں نے ابھی تک صحفِ انبیاء کے مطالبہ کو اس طرح سمجھا تھا۔جس طرح کلمتہ اللہ اوریوحنا اصطباغی نے اُن کو سمجھا تھا۔ (لوقا ۲۴: ۲۵تا ۲۶)۔ مقدس یوحنا

اصطباغی اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ سمجھتا تھا کہ صحیفہ یسعیاہ میں جس " خدا کے خادم" کا ذکر ہے اس کے پیشرو ہونے کا فخر اس کو حاصل ہے۔ پس وہ نہ صرف اپنی زندگی بلکہ" خدا کے خادم" کی زندگی کی علتِ غائی پر بھی سوچ بچار کرچکا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ یسعیاہ کے صحیفہ کے ۵۳باب کے مضمون کا اطلاق آنخداوند پر ہوتا ہے۔ اوریہ مضمون آپ کی زندگی اورموت کے کفارہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اندریں حالات یہ جائے حیرت نہیں ہوسکتی کہ اُس نے آنخداوند کودیکھ کراپنے شاگردوں سے کہا"۔ دیکھو یہ خداکا برہ ہے جودنیا کے گناہ اٹھالے جاتاہے"۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ اس قسم کے الفاظ کومنہ سے نہ نکالتا توہم کو حیرت ہوتی۔ اوراس کی خاموشی نہایت معنی خیزہوتی۔

(۲۔)

یہ امرقابلِ غور ہے کہ مقدس یوحنا اصطباغی آنخداوند کو مسیح موعود" کے نام سے نہیں پکارتا بلکہ آپ کا ذکریوں کرتاہے" جو میرے بعد آتاہے" (متی ۳: ۱۱)۔"میرے بعد کاآنے والا"(یوحنا ۱: ۲۷)۔یا صرف "آنے والا" (متی ۱۱: ۳۔لوقا ۷: ۲۰)۔اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ یہودی عوام الناس یسعیاہ کے صحیفہ کے ابواب (از ۴۰تا ۵۵)کو مسیح موعود کی ذات اورمشن سے متعلق نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے پولٹیکل مسیح کی آمد کے منتظر تھے جوآکر سیاسیات کا تختہ الٹ دیگا۔ پس مقدس یوحنا نے ایسی اصطلاح کا نام تک نہ لیا جس سے عوام الناس کے دلوں میں " مسیح موعود" کے مشن کے متعلق زبردست اورخطرناک غلط فہمی کا خدشہ تھا۔ اوریہی وجہ تھی کہ خود آنخداوند نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہی اس اصطلاح کو اپنے شاگردوں پر ظاہر کیا تھا۔ کیونکہ عوام الناس کی طرح آپ کے رسول بھی ایک پولٹیکل مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔ (مرقس ۱۰: ۳۷۔ اعمال ۱: ۶۔ متی ۱۲: ۱۱۔ لوقا ۱۹: ۱۱ وغیرہ)اسی سبب سے جب ابن اللہ نے " خدا کے خادم" کے تصور کو" مسیح موعود" کے تصور سے متعلق کرکے اپنے شاگردوں پر یہ راز منکشف فرمایا۔ (متی ۱۶: ۱۳تا ۲۶) تو مقدس پطرس آپ کی ملامت کرنے لگے۔ حق تو یہ ہے کہ اُس زمانہ میں کوئی آدمی بھی" خدا کے خادم" کے تصورکو اور" مسیح موعود" کے تصور

کو باہم اکٹھا کرکے ایک دوسرے سے متعلق نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مقدس لوقا ہم کو بتلاتا ہے ۔ کہ مقدس شمعون" راستاز، خدا ترس اوراسرائیل کی تسلی کا منتظر تھا"(۲: ۲۵)۔ یعنی مقدس شمعون صحیفہ یسعیاہ کے" خدا کے خادم" کا منتظر تھا۔ کیونکہ اس کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں تسلی دینے پر باربار زوردیا گیا ہے۔"تسلی دوتم میرے لوگوں کو تسلی دو۔(الخ ۴۰: ۱۔ ۴۹: ۱۳۔ ۵۱: ۳۔ ۵۷: ۱۸۔ ۶۱: ۲۔ ۶۶: ۱۱تا ۱۳)جب مقدس شمعون نے آنخداوند کو گود میں لے کر کہا" میری آنکھوں نے تیری نجات دیکھ لی ہے۔ جوتونے سب اُمتوں کے روبرو تیار کی ہے۔ تاکہ غیر قوموں کی روشنی دینے والا نور اور تیری اُمت اسرائیل کا جلال بنے "(لوقا ۲: ۳۰تا ۳۲)۔ تو اس کی نظروں میں اس صحیفہ کے وہ لفظ تھے جن میں لکھا ہے" میں تجھ کو غیر قوموں کے لئے نور بناؤنگا تجھ سے میری نجات زمین کے کناروں تک پہنچے"(۴۹: ۶)۔ " میں صیون کو نجات اور اسرائیل کوجلال بخشونگا"(۴۶: ۱۳) جب شمعون مقدسہ مریم کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ" یہ اسرائیل میں بہتوں کے گرنے اور اٹھنے کے لئے اورایسا نشان ہونے کے لئے مقرر ہوا ہے جس کی مخالفت کی جائیگی۔ بلکہ خود تیری جان بھی تلوار سے چھد جائیگی۔ تاکہ بہت لوگوں کے دلوں کے خیال کھل جائیں "۔(لوقا ۲: ۳۴تا ۳۵)۔ تواُس کااشارہ صحیفہ یسعیاہ کے اُن مقامات کی طرف ہے جن میں لکھا ہے کہ" خدا کا خادم" کو مخالفت ، ایذا اورموت برداشت کرنی ہوگی(۵۰: ۴تا۷۔ ۵۲: ۱۳۔ ۵۳: ۱۲ وغیرہ)۔ لیکن وہ ان مقامات کو" مسیح موعود" کے تصور سے متعلق نہیں کرتا۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ حضرت کلمتہ اللہ کی بعثت کے وقت متعدد لوگ مقدس نوشتوں پر غور وفکر کرکے" اسرائیل کی تسلی" کے منتظر تھے۔ اُمید ہے کہ ناظرین کرام پر اب ثابت ہوگیا ہوگاکہ آیہ زیربحث مابعد کے زمانہ کی بنائی ہوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقی واقعہ ہے جس پر تاریخ کی مہر ثبت ہے۔

(۳۔)

مقدس یوحنا اصطباغی سیدنا مسیح کے لئے دواور القاب استعمال کرتاہے۔ یعنی" خداکا برہ" (یوحنا ۱: ۳۰، ۳۶)اور" خدا کا بیٹا" (۱: ۳۴)۔ آپ کا ان الفاظ سےکیامطلب

تھا؟ الفاظ" خدا کا برہ" یسعیاہ نبی کے ۵۳باب میں نہیں پائے جاتے ۔ وہاں" خدا کے خادم" کو" برہ" کے ساتھ صرف تشبیہ دی جاتی ہے۔ " جس طرح برہ جسے ذبح کرنے کے لئے لے جاتے ہیں۔ بے زبان ہے" گوہر انجیل خوان جانتا ہے کہ ان الفاظ کا اطلاق ابتدا ہی سے سیدنا مسیح کی ذاتِ پاک پرکیا گیا۔(اعمال ۸: ۲۶تا ۳۶)۔ یرمیاہ نبی نے بھی اپنے آپ کو برہ کے ساتھ تشبیہ دی تھی" میں اس پالتو برہ کی مانند تھا جسے ذبح کرنے کو لے جاتے ہیں"(۱۱: ۱۹)۔ لیکن یہاں بھی الفاظ "خدا کا برہ" نہیں پائے جاتے الفاظ" خدا کا برہ" سے مراد برہ ہے جسے خدا خودمہیا کرتا ہے۔ اوراس کا اشارہ پیدائش ۲۲: ۸، ۱۳ کی طرف ہے جہاں خدا نے اضحاق کی قربانی کے وقت ابراہام کے لئے مینڈھا مہیا کیا تھا۔ "برہ کے لفظ نے قدرتاً مقدس یوحنا اصطباغی کے دل میں اہلِ یہود کی قربانی کا خیال ڈالا کیونکہ عیدفسح نزدیک تھی(یوحنا ۲: ۱۲تا ۱۳)اورپاس ہی سڑک پر بروں کے گروہ ذبح ہونے کے لئے یروشلیم کی جانب جارہے تھے۔ پس عیدِ فسح کی قربانی کے برہ کا خیال یوحنااصطباغی کے ذہن میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد کے زمانہ میں سیدنا مسیح کوقربانی کا برہ کہا گیا ہے یوحنا ۱۹: ۳۶۔ ۱پطرس ۱: ۱۹۔ عبرانیوں ۹: ۱۴ وغیرہ)۔ جب ہم اس امر کو یادکرتے ہیں کہ یوحنا اصطباغی کاہنوں کے فرقہ میں سے تھا تواس خیال کواوربھی تقویت ملتی ہے۔ مقدس یوحنا اصطباغی کے پاس مختلف طبقوں کے لوگ جوق درجوق آتے تھے۔ اوراپنے گناہوں کا اقرارکرکے بپتسمہ پاتے تھے(متی ۳: ۶) اور وہ آنخداوند کی پاک اور مقدس زندگی سے بھی کماحقہ واقف تھا۔ (متی ۳: ۱۴) اوروہ محسوس کرتا تھا کہ قوم یہود کو کفارہ کی کس قدر ضرورت ہے اس نے یسعیاہ ۵۳باب پر پیدائش ۲۲: ۸ کی روشنی میں غوروتدبر کرکے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ" خدا کا خادم" ستایا گیا توبھی اس کے برداشت کی اورمنہ نہ کھولا۔ جسطرح برہ جس کو ذبح کرنےکولے جاتے ہیں ۔ بے زبان ہے اسی طرح یہ برہ جس کو خداوند نے خودمہیا کیا ہے خاموش ہوگا۔ وہ اپنی جان کا دکھ اٹھاکر اُن کی بدکرداری کوخود اٹھائے گا ۔خداوندکو پسند کیا کہ اس برہ کو مہیا کرے۔ تاکہ وہ کچلا جائے۔ اُس کی جان گناہ کی قربانی کےلئے گذرانی جائے۔ اُس نے اپنی جان موت کےلئے انڈیل دی۔ اُس نے

بہتوں کے گناہ اٹھالئے"اندرین حالات یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُس نے ابن اللہ کو آتے دیکھ کر اپنے شاگردوں سے کہا کہ" دیکھو یہ خداکا برہ ہے۔ جودنیاکا گناہ اٹھالے جاتاہے۔

(۴۔)

مقدس یوحنا اصطباغی آنخداوند کےلئے ایک اورلقب استعمال کرتاہے "خداکا بیٹا" (یوحنا ۱: ۳۴) اس مقام پر یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ عبرانی زبان میں لفظ"برہ" کےلئے لفظ"طالی" آیاہے۔ اورآرامی زبان میں لفظ "طلی" کے معنی ہیں" بیٹا،لڑکا ، جوان،خادم"۔ چنانچہ یہی لفظ بصورتِ تانیث مقدس مرقس کی انجیل میں سیدنا مسیح کے آرامی الفاظ میں آیاہے "طلیتا قومی جس کاترجمہ یہ ہے کہ اےلڑکی میں تجھ سے کہتاہوں اٹھ"(۵: ۴۱)۔ انجیل اوّل میں یہی لفظ آخری معنی یعنی "خادم " کے معنوں میں استعمال ہوا ہے(۸: ۶، ۱۳)پس جب مقدس یوحنا اصطباغی یہ لقب" خداکا بیٹا" استعمال کرتاہے تو اس کا مطلب "خدا کا خادم" ہےجویسعیاہ ۵۳: ۱۱تا ۱۲ کے مطابق بہتوں کےگناہ اٹھالے جاتاہے۔ چونکہ لفظ طالی اورطلی دونوہم آواز اورمشابہ ہیں مقدس یوحنا ان الفاظ کی مشابہت اورہم آہنگی سے فائدہ اٹھاکر کہتاہے " کہ خداکا بیٹا" اس برہ کی مانند ہے جو خدا کے خادم کی طرح بے داغ ہے۔ اوریہی بات ابتدائی کلیسیا میں مقدس پطرس اور دیگر رسولوں کی زبان پر تھی۔ (اعمال ۳: ۱۳۔ ۴: ۲۷تا ۳۰۔ وغیرہ)۔

(۵۔)

مقد س یوحنا اصطباغی فرماتاہے" میں تواُسے پہچانتا نہ تھا۔مگر جس نے مجھے پانی سے بپتسمہ دینے کو بھیجا۔اُس نے مجھ سے کہا کہ جس پرتو روح کو اترتے اور ٹھہرتے دیکھے وہی روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے چنانچہ میں نے دیکھا اورگواہی دی ہے۔ کہ یہ خدا کا بیٹا ہے"(یوحنا ۱: ۳۳تا ۳۴)۔صحیفہ یسعیاہ کے ناظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس نشانی کا ذکر اس کتاب کے ۴۲: ۱ اور۶۱: ۱ میں ہے۔ چونکہ مقدس یوحنا اصطباغی اورابن اللہ دونوں قریبی رشتہ داراورہم عمر تھے(لوقا ۱: ۲۶تا ۳۶) اوردونوں نے حضرت یسعیاہ کے صحیفہ پر تدبر اورغوروفکر کرکے اپنے اپنے مشن اورزندگی کے مقصد کی نسبت فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ دونو نے اکثر

اوقات اس موضوع پر باہم گفتگو اور تبادلہ خیالات کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جونہی مقدس یوحنا نے اس خاص امتیازی نشان کو دیکھا اُس نے فوراً پہچان لیاکہ اس کا قریبی رشتہ دار راستبازسیدنا مسیح ہی خدا کا وہ خادم ہے جس کا ذکر یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں آیا ہے۔ پس مقدس یوحنا اصطباغی یہ جانتا تھاکہ خدا نے اُسے " خدا کے خادم" کا پیشرو مقررکیا ہے۔تاکہ اُس کے آگے اُس کی راہ تیارکرے۔ تاکہ" خدا کا خادم" سیدنا مسیح خداکا برہ بن کر دنیا کا گناہ نیست ونابود کرکے روح القدس کا بپتسمہ دے۔

پنطوس پلاطوس

"پنطوس پلاطوس کی حکومت میں دکھ اٹھایا اور مصلوب ہوا"

تاریخ ہم کو پنطوس پلاطوس کی گورنری کے واقعات کے علاوہ کچھ نہیں بتلاتی ۔اس شخص کے نام کے گرد متعدد روایات جمع ہوگئی ہیں لیکن وہ سب کی سب اُس کی موت کے صدیوں بعد کی ہیں۔ لہذا وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ پلاطوس اوراُس کی بیوی کلاڈیا کے متعلق جوکچھ ہمیں معلوم ہے وہ دویا تین قدیم مصنفوں کی طفیل ہے جواُن کے قریباً ہم عصر تھے۔ اُن میں سے ایک سکندریہ کا فلاسفر فائلو سیدنا مسیح سے دس بیس سال پہلے پیدا ہوا تھا۔پس وہ پلاطوس کا ہم عمر تھا۔ یہودی مورخ یوسیفس بھی اپنی کتابوں میں پلاطوس کا ذکرکرتا ہے چاروں انجیل نویس بھی ہم کواُس کی زندگی کے چند گھنٹوں کی جھلک دکھلاتے ہیں۔

(۲۔)

قیصر طبریاس (Tiberius) نے ۲۶ء میں پلاطوس کو یہودیہ کا گورنر مقررکیا۔ قیصریہ اس کا دارالسلطنت تھا۔ اُس زمانہ میں روم سے قیصریہ تک سفر کرنے میں دوماہ کا عرصہ درکا رتھا۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ قیصریہ آنے سے پہلے راستہ میں پلاطوس نے سکندریہ میں چند یوم گذار کراپنے پیش روسابق گورنر ولیرئیس گریٹس (Valerius Gratus) سے ملاقات کرکے یہودیہ کے حالات کی نسبت پوچھ گچھ کی ہوگی۔

قیصریہ اُس زمانہ میں بڑا زبردست شہر تھا اور بعض باتوں میں یروشلیم سے بھی زیادہ اہم شمار ہوتا تھا۔ ہیرودیس

اعظم نے اس شہر کی بنیاد ڈال کر اس کا نام قیصریہ رکھا تھا۔ اس شہر میں قیصر کا مندر تھا۔ جس میں اس کا ایک بڑا قدآور بُت نصب تھا۔ یہ شہر عظیم الشان عمارتوں سے مزین تھا۔ اور گورنر کا محل بھی یہیں واقع تھا۔

(۳۔)

پلاطوس نے ۲۶ء میں قیصریہ میں اپنا قدم رکھتے ہی رعایا سے بگاڑ لی۔ چنانچہ مورخ یوسیفس لکھتا ہے "پلاطوس نے رات کے وقت یروشلیم میں پرچم بھیجے جن پر قیصر کی مورت تھی۔ جب صبح ہوئی اور یہود کی نظر اُن پر پڑی تو ہر جگہ غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اس اقدام سے ان کی شریعت پاؤں تلے روندی گئی تھی۔۔۔۔ یہود جوش میں آکر قیصریہ آئے اور پلاطوس کی منت کرنے لگے کہ وہ ان جھنڈوں کو یروشلیم سے باہر لے جائے۔ جب اُس نے صاف انکار کردیا تو وہ زمین پر لیٹ گئے اور پانچ دن رات وہیں پڑے رہے۔۔۔ پلاطوس نے فوج کو اُن کا گھیرا ڈالنے کا حکم دیا اور یہود کو کہا کہ اگر وہ اپنی ہٹ سے بازنہ آئے تو وہ تہ تیغ کردئیے جائینگے۔ اس پر اُنہوں نے اپنی گردنیں ننگی کردیں۔ اور چلا کر کہنے لگے کہ ہمیں موت منظور ہے لیکن شرع کی بے حرمتی منظور نہیں۔ اس پر پلاطوس دنگ رہ گیا اور اُس نے حکم دیا کہ پرچم یروشلیم سے باہر نکال لے جائیں" (Whiston's Josephus: Jewish Wars Book 2.Ch:9 Page 601)

یہ واقعہ موسم خزاں ۲۶ء میں ہوا جب پلاطوس نے موسمِ گرما میں پہلی بار یروشلیم جانے سے پہلے اپنی فوج کو بھیجا تھا اُس سے پہلے گورنر مورت والے پرچم لے کر یروشلیم میں داخل نہیں ہوا کرتے تھے۔ پلاطوس اس بات سے ضرور واقف تھا لیکن اُس نے اہلِ یہود پر شروع ہی میں " گربہ کشتن روزِاول " کے مصداق اپنا رعب جمانے کی خاطر اس قدم کو اٹھایا تھا۔ لیکن پلاطوس کو خفت اٹھانی پڑی اور یوں اس پہلے مقابلہ میں اہلِ یہود کی جیت ہوگئی۔

یہ امر قابل غور ہے کہ ایسے آڑے وقت اور نازک موقعہ پر یہود کے سردار کاہن کیفا نے اس تحریک میں کھلم کھلا کوئی حصہ نہ لیا۔ وہ نہایت دوراندیش اور مردم شناس شخص تھا جو ہمیشہ موقع کی تاڑ میں رہتا تھا۔ وہ اپنے عالی شان محل میں بیٹھا چپکے سے دیکھ رہا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ولیریئس گریٹس سابق گورنر نے اپنی گیارہ سالہ حکومت کے

دوران میں چار دفعہ سردار کاہن بدلے تھے۔ اورچوتھی دفعہ اس نے کیفا کو نامزد کیا تھا۔ کیفا اپنی گدی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اوروہ جانتا تھا کہ یہ بات پلاطوس کے اختیار میں تھی کہ وہ اس گدی پر برقرار رکھے یا برطرف کردے۔ اگرپلاطوس کی سکندریہ میں ولیرئیس سے ملاقات ہوئی ہوگی توقیاس یہی چاہتا ہے کہ اُس نے پلاطوس کو فریسیوں اورصدوقیوں کے حالات بتلا کریہی صلاح دی ہوگی۔ کہ وہ سردارکاہن کیفا کو گدی پر برقرار رہنے دے کیونکہ وہ کام کا آدمی ثابت ہوگا۔ لیکن یہود اوراُن کے سردارکاہن کو اپنے قبضہ اقتدار میں رکھے۔پس پلاطوس نے یہودی عوام پر رُعب جمانے کی خاطر اورسردار کاہن کیفا پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر یروشلیم ایسے پرچم بھیجے جن پر قیصر کی مورُت تھی۔ لیکن اس کانتیجہ اُس کے حق میں الٹا ثابت ہوا۔ اورکیفا نے کچھ کہے یا کئے بغیر اہلِ یہود کے مذہبی جنون سے فائدہ اٹھاکر پلاطوس کو نیچا دکھادیا۔

(۴۔)

جب پلاطوس یہودیہ کا گورنر مقررہوا تو یروشلیم میں پانی کی سخت قلت تھی۔چونکہ یہ شہر اونچی پہاڑیوں پر آباد تھا لہذا ابتدا ء ہی سے اس کےباشندے پانی کی قلت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہے تھے۔ محاصرہ کےایام میں دشمن نہایت آسانی سے پانی کی رسد کاٹ سکتے تھے (۲۔تواریخ۳۲: ۱تا ۵)پس مختلف صدیوں میں مختلف یہودی بادشاہوں نے پانی کی رسد کی دقت کورفع کرنے کی بے سود کوششیں کی تھیں۔غالباً سلیمان بادشاہ نے یروشلیم سے بھی اونچی گھاٹیوں سے تین تالابوں کے ذریعہ (جن کو سلیمانی تالاب کہتے ہیں)یروشلیم میں پانی لانےکا انتظام کیا تھا۔ سلیمان کے بعد پلاطوس پہلا شخص تھا جس نے پانی کی قلت کی دقت کو حل کیا تھا۔ اس نے قریباً پچیس میل کے پکے نالے (Aqueducts) بنواکر یروشلیم کی ہیکل میں پانی پہنچادیا تھا۔ جو انجنیئری کا کمال تھا۔ یہ ظاہرہے کہ اس قسم کا کام(جس میں ہیکل کی عمارت کے بعض حصوں میں شکست اورریخت کی الجھن کا سوال تھا) بااختیاراکابر یہود کی

صلاح اورمنظوری کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں۔ پہنچ سکتا تھا یہ بھی ناممکن ہے کہ اخراجات کے زرکثیر کا سوال اٹھائے بغیر یہ تجویز مکمل کردی گئی ہو۔ رُومی قاعدہ کے مطابق پبلک ورکس کے اخراجات کی، پبلک خود متحمل ہوتی تھی۔ لیکن یروشلیم کے حالات کچھ خاص حالات تھے۔ کیونکہ ہر بالغ سے نیم مثقال کا نقرئی سکہ جبریہ وصول کرکے ہیکل کے خزانہ میں جمع کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صدقہ خیرات اور نذریں بھی اس خزانہ میں جمع کی جاتی تھیں۔ان ذرائع سے ہیکل کی سالانہ آمدنی ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ کے لگ بھگ تھی، قدرتی طورپر پلاطوس چاہتا تھا کہ پانی کے انتظام کے اخراجات ہیکل کے خزانہ سے ادا کئے جائیں جو پبلک کا روپیہ تھا۔ صدوقی اور سردارکاہن اس قدرزرخیز دینا نہیں چاہتے ہونگے لیکن سردارکاہن کیفا نے اس رقم کی ادائیگی کا وعدہ ضرور کردیا ہوگا ورنہ پلاطوس اس کو برطرف کردیتا۔ جس طرح سابق گورنر نے حنہ سردارکاہن کو اُس کی دولت وثروت کے باجود برطرف کردیا تھا۔ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ پلاطوس کے آنے سے پہلے کیفا سردارکاہن تھا۔ اوروہ پلاطوس کی دس سالہ گورنری کے دوران اپنی ہشیاری، چالبازی اورموقعہ شناسی کی وجہ سے اس گدی پر متکمن رہا۔ پس جب ہیکل کے خزانہ سے پانی کے احزاجات ادا کئے گئے توکیفا سردارکاہن طوعاً وکرہاً اس کی ادائیگی پر راضی تھا۔

یہودی مورخ یوسیفس لکھتا ہے" اس کے بعد پلاطوس نے ایک اور فتنہ کھڑا کردیا۔اُس نے نذرانہ کے پاک روپیہ سے پانی کے نالے پکے بنوائے جن کے ذریعہ اُس نے چار صد فرلانگ پانی بہم پہنچایا۔ اس پر یہودی عوام الناس بھڑک اٹھے اورجب پلاطوس یروشلیم آیا تو ہزاروں کی بھیڑ نے اُس کے دربار کے پاس جمع ہوکر غوغا مچایا۔ اس بات کی پلاطوس کو پہلے ہی سے خبر لگ گئی تھی کہ فساد ہونے والا ہے۔ پس اُس نے ہجوم میں مسلح سپاہی غیرفوجی لباس میں بھیجے اوراُن کوحکم دیا کہ مفسدوں کو نرغہ میں گھیر کر ان پر لاٹھی چارج کردیں۔ بہت سے یہودی مارے گئے اور زخمی ہوگئے۔ جب بھاگڑ مچی تو بہت لوگ دوسروں کے پاؤں تلے روندے گئے۔ یوں یہ فساد فرد کردیا گیا"۔

Whiston's Josephus Antiquities, Book 18, Ch.9, P.474.
Jewishwars, Bk.2Ch.9.P.6011 Published by Ward Lock Co. London

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پلاطوس کو اس ہونے والے فساد کی خبر پہلے سے کس نے دی تھی؟اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیفا نے اُس کو خفیہ طورپر آگاہ کردیا تھا۔ پس یوں چالبازی سےکام لے کر اُس نے اہلِ یہود اورپلاطوس دونوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس واقعہ نے اہلِ یہود کو پلاطوس سے برگشتہ کردیا۔ سردارکاہن کیفا بھی موقعہ کی تاڑمیں رہا جس سے وہ پلاطوس کو نیچا دکھا کر ہیکل کے خزانہ پر ہاتھ ڈالنے کا بدلہ لے سکے۔

(۵۔)

۲۹ء میں سیدنا مسیح کے مقدمہ نے اس کے ہاتھ میں یہ زرین موقعہ دے دیا۔ کیفا نے یہودی شریعت کا خون کرکے اورتمام شرعی پابندیوں کو پاؤں تلے روند کر سیدنا مسیح پر رات کے وقت موت کا فتویٰ صادرکردیا۔ جمعہ کے دن علی الصبح اس نے سیدنا مسیح کو کشاں کشاں گورنر کی عدالت میں حاضر کردیا تاکہ وہ اُس کے فتویٰ پر عمل کرکے آپ کو مصلوب کرنے کا حکم صادرکرے۔ جب پلاطوس نے رومی سلطنت کے قانون کی رُو سے آپ کو بری قراردے دیا تو سردار کاہن کو وہ موقعہ مل گیا جس کی وہ اتنی مُدت سے تاڑمیں تھا۔اُس نے گورنر کو کہا کہ" اگر تو اس کو چھوڑدیگا تو تو قیصر کا خیر خواہ نہیں"۔اس دھمکی کا مطلب یہ تھاکہ یہودیہ کے گورنر پلاطوس کی شکایت شام کے وائسرے وٹیلیئس (Vitellius) سے کی جائیگی۔غداری کا الزام سنتے ہی پلاطوس کانپ اٹھا۔ اُس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ کیفا کو کسی نہ کسی طرح خوش کرے لیکن اُس کی ایک نہ چلی۔ کبھی اُس نے چالبازی سےکام لے کر سیدنا مسیح کو ہیرودیس کے پاس بھیجا دیا۔ کبھی اُس نے سیدنا مسیح کو پٹواکر کیفا کی آتشِ انتقام کو فرد کرنے کی تدبیر کی ۔کبھی اُس نے یہود کے قومی جذبات کو اپیل کرکے سیدنا مسیح کو چھوڑنا چاہا۔ لیکن اُس کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ سردارکاہن کیفا اپنی بات پر اڑارہا ۔اورغداری کے الزام کی تلوارکو پلاطوس کی آنکھوں کے سامنے چمکاتارہا۔ حتیٰ کے پلاطوس پر یہ ظاہر ہوگیاکہ اس مقدمہ میں اُس کی اپنی موت اورزندگی کا سوال درپیش ہے اورکہ سیدنا مسیح اورپلاطوس میں سے ایک شخص کا مرنا ضروری ہے۔ پلاطوس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس نے صوبہ بھر میں اپنے ظلم اور تعدی کی وجہ سے بدنظمی پھیلا رکھی تھی۔

چنانچہ سکندریہ کا یہودی فلاسفر فائلو کہتا ہے کہ"پلاطوس رشوت خوار تھا ۔ اُس نے صوبہ بھر میں لوٹ مار مچار رکھی تھی۔ وہ ہر ایک سے متکبرانہ پیش آتا تھا۔ اور رعایا پر سخت مظالم ڈھاتا تھا۔ لوگوں کو عدالت میں لائے بغیر اوراُن کا جرم ثابت کئے بغیر وہ اُن کو مرواڈالتا تھا۔ اُس کی انسانیت سوز بدکرداریاں ایک سلسلہ لامتناہی تھیں" ۔ مقدس لوقاانجیل نویس بھی ہم کو بتلاتا ہے کہ پلاطوس نے گلیلی لوگوں کا خون اُن کے ذبیحوں کے ساتھ ملادیا تھا(۱۳: ۱) اب سردار کاہن اس پر قیصر سے غداری کا الزام لگانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پس اپنی جان بچانے کی خاطر وہ کیفا کے آگے جھک گیا۔ اناجیل کے آخری سین کے الفاظ نہایت واضح طورپر اس بزدل گورنر کے کیریکٹر کوظاہر کرتے ہیں۔ " جب پلاطوس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا توپانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اُس نے یسوع کو کوڑے لگواکر اُن کے حوالہ کیاتاکہ صلیب دی جائے"(متی ۲۷: ۲۴تا ۲۶)۔

(۔۶)

پلاطوس کا آخری کارنامہ سامریوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یوسیفس لکھتا ہے "سامریوں کی قوم کے ایک شخص نے سامریوں کو کہا کہ گریزیم پہاڑپر(جواِن کی نظروں میں مقدس ترین پہاڑ ہے)(یوحنا ۴: ۲۰)حضرت موسیٰ نے جو مقدس ظروف رکھے تھے وہ اُن کو دکھلائیگا۔ پس سامری مسلح ہوکر بڑی تعداد میں وہاں جانے لگے ۔ لیکن پلاطوس نے سوار اورپیادہ فوج بھیج کر تمام راستوں کو بند کرکے ناکہ بندی کردی۔ فوج نے لوگوں پر حملہ کرکے بہتوں کو قتل کردیا اور قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب فساد فردہوگیا توسامیروں نے ویٹلیئس کے پاس جو شام (Syria) کا وائسرے تھا۔ گورنر پلاطوس کی شکایت کی اوراُس پر ناحق خون بہانے کا الزام لگایا۔ اس پر وٹیلیئس نے مارسیلس (Marcellus) کویہودیہ کا انتظام کرنے کیلئے بھیج دیا۔

اورپلاطوس کو حکم دیاکہ روم جاکر اہلِ یہود کے عائد کردہ الزامات کا جواب دے"

Whiston's Josephus Antiquities, Book 18, Ch.4.P476

پس دس سا ل کی حکومت کے بعد ۳۶ء میں پلاطوس واپس قیصر کے حضورجوابدہی کے لئے روم کی جانب واپس روانہ ہوگیا۔ ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ واپسی کے وقت راہ میں اس کا کیسا حال ہوا ہوگا۔ دن کوموت کا خیال اور رات کو ڈرؤانے خواب اُس کے ساتھی تھے۔ جب وہ دارلسلطنت روم میں پہنچا تو(جس قیصر کے لرزہ خیز حکم کی وجہ سے وہ روم حاضر ہوا تھا اُس کو خود موت کے فرشتہ نے اعلیٰ ترین منصف کی عدالت میں حاضر ہوکر اپنے اعمال کے جواب دینے کا پیغام پہنچادیا تھا۔

(۷۔)

پلاطوس کا کیا حشر ہوا؟ اس کے انجام کے متعلق کلیسیائی روایت کثرت سے ہیں لیکن تواریخی لحاظ سے ان کی قیمت صفر سے بھی کم ہے۔ غالباً مسیحی مورخ قیصریہ کے بشپ کا قول درست ہے کہ پلاطوس کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کردے۔

Ecclesiastical History.2.6.7

پلاطوس کے شریکِ جرم سردارکاہن کیفا کا ذکر انجیلی مجموعہ میں پھر ایک دفعہ آتا ہے۔ جب وہ" سردارکاہن حنہ اوریوحنا اورسکندراورسردارکاہن کے گھرانے کے لوگوں کے ساتھ مقدس پطرس اورمقدس یوحنا رسول سے بازپرس کرکے اُن کو دھمکاتا ہے (اعمال ۴: ۶۔ ۲۲) اس کے بعد بھی سردار کاہن کا ذکرآتا ہے ۔جوکلیسیا کو ایذائیں پہنچانے پر تلا ہوا تھا غالباً یہ سردارکاہن کیفا ہی تھا ۔ (اعمال ۵: ۱۷، ۲۱، ۲۷، ۷: ۱، ۱۹: ۱وغیرہ)۔

۳۶ء میں پلاطوس کے یہودیہ رخصت ہونے کے بعد کیفا بھی سردارکاہن کی گدی سے اتاردیا گیا۔ اسی سال یعنی ۳۶ء کے موسمِ گرما میں مقدس پولوس رسول صحرائے عرب سے واپس یروشلیم کو لوٹے اور پندرہ رسولوں کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اس کے بعدآپ نے انجیل جلیل کی نجات کا جانفزا پیغام اقصائے عالم تک پہنچادیا۔

ابنِ اللہ کی صلیبی موت اوریہودی قانون

سیدنا مسیح کے مقدمہ کی سماعت دوعدالتوں میں ہوئی اوردونوں عدالتوں میں آپ پر موت کا فتویٰ صادرہوا۔ پہلی بارآپ کواہلِ یہود کی عدالت میں پیش کیا گیا جہاں سردار کاہن نے جج کی حیثیت سے آپ پر فتویٰ لگایا۔ پھر وہی جج رومی عدالت میں مدُعی بن گیا اور رومی گورنر نے آپ کو مصلوب کرنے کا حکم دیا۔اس مضمون میں ہم ابنِ اللہ کے مقدمہ کی روئداد پریہودی قانون کے نقطہ نظر سے بحث کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ آیا حضرت ابنِ اللہ کے ساتھ قانونی پہلو کے مطابق واقعی انصاف کیا گیا تھا۔ یاآپ کے جج سردارکاہن کائفا نے آپ کو مستوجب قتل قراردے کریہودی قانون کا خون کیا تھا۔

(۱-)

جب ہم اناجیل اربعہ کی صلیبی بیان کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں توہم پر واضح ہوجاتاہے کہ اس بیان کی صحت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ لارڈ شائر کہتے ہیں ۔" ہر شخص اوربالخصوص ہر جج پر (جس کا سابقہ شہادت اورگواہی سے پڑتاہے)یہ بات فوراً ظاہرہوجاتی ہے کہ اگرچہ صلیبی بیان کی تفاصیل میں فرق ہے۔ اورہرانجیل نویس کے بیان کرنے کا طریقہ نرالا ہے۔ اور چاروں اناجیل کے بیان کرنے والے کی سمجھ کے مطابق بیان کی مختلف پہلوؤں پر زوردیا گیا ہے تاہم صلیبی موت کا بیان وزن رکھتاہے اوربیان کردہ واقعات کی صحت میں کسی کوکلام نہیں ہوسکتا[1]۔

ابنِ اللہ کے مقدمہ کا بیان نہایت سادہ الفاظ میں لکھا گیا ہے جس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کودخل نہیں۔ وہ افراط اورتفریط دونوں سے خالی ہے اوریہی وجہ ہے کہ وہ جاذبِ توجہ ہے اورانسانی دماغ پرایک ناقابلِ فراموش نقش قائم کردیتاہے ۔ یہ سیدھے سادے الفاظ آنکھوں کے سامنے ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ انسان بے اختیار متاثر ہوجاتاہے۔

[1] The Trial of Jesus Christ by the Rt. Honorable Lord Shaw of Dunfermline,k,c.L.L.D Lord of appeal pp9-101

(۲۔)

اہلِ یہود کا قانون رومی سلطنت کے قانون سے زیادہ قدیم اورسخت گیر تھا۔ بالخصوص ملزم کی موت اورزندگی کے سوال کے موقعہ پر یہودی قانون نے ایسی قیود اور پابندیاں لگارکھی تھیں جن سے ہر شخص پر یہ واضح ہوجاتا تھا کہ یہ مقدمہ نہایت سنجیدہ ہے۔ اس قانون کے مطابق ہر ممکن طورپر یہ خاص احتیاط کی جاتی تھی کہ ملزم کے ساتھ کسی قسم کی بے انصافی ہونے نہ پائے اورمقدمہ کے دوران میں کوئی ناجائز بات یاغلطی سرزد نہ ہو جوملزم کے خلاف جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہودی قانون انسانی زندگی کو نہایت واجب الاحترام شے خیال کرکے ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ مقدمہ کے وقت ہر قسم کی احتیاط کام میں لائی جائے۔

یہودی قانون کے مطابق جب کسی کو موت کی سزا دی جاتی تھی تو مجرم کو عموماً سنگسارکیا جاتا تھا۔ بعض اوقات مجرم کو غرقِ آپ کردیا جاتا تھا یااُس کو پھانسی دی جاتی تھی یااُس کا سرتن سے جدا کردیا جاتا تھا ۔ لیکن کسی مجرم کو صلیب نہیں دی جاتی تھی۔

مجرم کو عدالت سے دور فاصلہ پر سزا دی جاتی تھی یہود کی اصطلاح میں اس جگہ کو " خیمہ سے باہر" کہا جاتا تھا۔ لیکن موت کی سزا دینے وقت بھی ملزم کی جان بچانے کی تدبیر کی جاتی تھی۔ چنانچہ مشناہ میں لکھا ہے " چاہیے ایک شخص عدالت کے کمرہ کے دروازہ کے باہر رومال ہاتھ میں لئے کھڑے رہے اوردوسرا گھوڑے پر سوار ہوکر اُتنی دورکھڑا رہے کہ وہ رومال کو ہلتا دیکھ سکے اگر ملزم کے آخری لمحوں میں بھی کوئی شخص یہ ثابت کرنے کیلئے تیارہوکر ملزم بے گناہ ہے تو جوشخص عدالت کے دروازہ پر کھڑا ہوا وہ رومال کو ہلائے اورجونہی سواراس رومال کوہلتا دیکھے وہ گھوڑے کو دوڑاکر مقتل پر پہنچے اور ملزم کو واپس لے آئے تاکہ اُس کے مقدمہ کی دوبارہ سماعت ہو"۔

(۳۔)

اس میں شک نہیں کہ سنہیڈرن (جس کو انجیل میں" صدرِعدالت کہا گیا ہے) کو یہ اختیارحاصل تھا کہ ابن اللہ کو

گتسمنی کے باغ میں گرفتار کرلے یہ مجلس اہلِ یہود کی جنرل کونسل تھی اورا کہتر (۷۱) اشخاص پر مشتمل تھی۔ اس جنرل کونسل کی ایک اعلیٰ انتظامیہ کمیٹی تھی جس کے تئیس (۲۳)رکن تھے۔ اگرچہ یہودیہ کا ملک ایک رومی صوبہ تھا تاہم قیصر نے دانشمندی کو کام میں لاکر اس کو دینی اُمور میں سوراجیہ کا حق عطا کردیا تھا۔ جنرل کونسل کا صدرسردار کاہن کیفا تھا اورکونسل میں فریسی اور صدوقی لیڈر دونوں شامل تھے۔ اس کے فیصلے یہودی شریعت اوریہودی قانون کے مطابق ہوتے تھے۔ یہودی شریعتِ کتب عہدِ عتیق میں موجود تھی۔ اوریہودی قانون طالمود میں جمع کیا گیا تھا۔ طالمود کے مرکزی حصہ کو مشنا کہتے ہیں۔ جس میں سے ہم نے سطورِبالا میں ایک قانون نقل کیا ہے۔ یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے۔ کہ خداوند مسیح کی زندگی میں مشناہ کے یہودی قوانین پرعمل درآمد کیا جاتا تھا۔

(۴۔)

ابنِ اللہ کے ایک حواری یہوداہ اسکریوتی کی غداری کی وجہ سے آپ بآسانی تمام گرفتارہوگئے۔ اس سازش میں جنرل کونسل کے ارکان بھی شامل تھےلیکن انہی لوگوں نے آپ کے مقدمہ کی سماعت بھی کرنا تھی۔ پس جنرل کونسل کے ممبروں نے اس سازش میں حصہ لے کر یہودی قانون کی خلاف ورزی کی۔ علاوہ بریں ان ممبروں نے نہ صرف سازش میں حصہ لیا بلکہ وہ تیس روپیہ کی رشوت دینے سے بھی نہ جھجکے۔ پس صریحاًوہ الہٰی شریعت اوریہودی قانون کوتوڑنے کے مرتکب ہوئے۔ اگر ابن اللہ کے خلاف فیصلہ کی اپیل کی جاسکتی تویہ ظاہر ہے کہ آپ رہا کردئیے جاتے ۔لیکن جنرل کونسل کوئی ماتحت عدالت نہیں تھی جس کے فیصلہ کی کسی اعلیٰ عدالت میں اپیل ہوسکتی۔ وہ خود اعلیٰ ترین عدالت تھی جس کے فیصلوں کے خلاف اپیل دائر نہیں ہوسکتی تھی۔

چونکہ سیدنا مسیح کا مقدمہ زندگی اورموت کا مقدمہ تھا لہذا یہ ضروری امر تھا کہ اُن تمام قیود کا لحاظ رکھا جاتا جو الہٰی شریعت اوریہودی قانون نے اس معاملہ میں پیش بندی کے طورپر لگا رکھی تھیں ۔ جہاں تک ابنِ اللہ کے مقدمہ کا تعلق ہے عدالتِ اعلیٰ کا ان پابندیوں کو ملحوظ رکھنا اوربھی زیادہ ضروری تھاکیونکہ آپ کے تمام حواری او رپیرو اپنی

جانوں کے خوف کے مارے آپ کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اورآپ کے خلاف نہ صرف اعلیٰ ترین طبقہ کے روسا پرے باندھے تھے بلکہ عامتہ الناس کے جذبات کی آگ بھی بھڑک رہی تھی۔اندرین حالات عدالتِ اعلیٰ کا فرض تھا کہ قانون کے مطابق اورقانون کے اندرآپ کے جائز حقوق کی خود حفاظت کرتی۔

(۵۔)

حضرت ابنِ اللہ کے مقدمہ میں جنرل کونسل نے شروع سے لے کر آخر تک الہٰی شریعت اوریہودی قانون کی تمام پابندیوں کی باڑ کو اکھاڑ پھینکا اس کونسل کے ارکان سب امور کو فوری طورپر ختم کرنا چاہتے تھے۔ پس اُنہوں نے جلدی کی اوراس جلدی کے سبب یہودی قانون کے احتیاطی اُموراور تدابیر کو پسِ پشت پھینک دیا۔ اُنہوں نے رات کے وقت اس مقدمہ کی سماعت شروع کی اوراُسی رات فیصلہ بھی کردیا۔ یہ دونوں باتیں یہودی قانون کے سراسر خلاف تھیں۔ اس قانون کے مطابق کوئی ایسا مقدمہ رات کے وقت شروع نہیں کیا جاسکتا تھا۔چہ جائیکہ رات کے وقت اس کی پیروی بھی کی جائے اورفیصلہ بھی سنادیا جائے۔اگرکسی مقدمہ کی دن کے وقت سماعت شروع ہوتی اوردورانِ سماعت رات پڑجاتی تویہودی قانون کے مطابق لازم تھا کہ مقدمہ لگے دن پر ملتوی کیا جائے۔ چنانچہ مشناہ میں خاص طورپر ہدایت کی گئی ہے کہ"دیوانی مقدمات صرف دن کے وقت شروع کئے جائیں اور ان کا فیصلہ غروبِ آفتاب کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جن مقدمات کا تعلق ملزم کی زندگی اورموت کے ساتھ ہے۔ وہ صرف روزِ روشن میں ہی شروع کئے جائیں اوردن کی روشنی میں ہی فیصلہ پائیں۔ اگر فیصلہ کی روسے ملزم رہا ہوجائے تو وہ اُسی روز رہا کیا جائے لیکن اگر وہ موت کا مستوجب گردانا جائے۔ تولازم ہے کہ مقدمہ دوسرے دن پرملتوی کردیا جائے اوررات کا وقفہ درمیان میں پڑے حضرت ابن اللہ کے مقدمہ میں جنرل کونسل کے ججوں نے ایسی تعجیل کی جس کی نظیر یہودی تاریخ میں نہیں ملتی۔اُنہوں نے تمام پابندیوں کو جو یہودی قانون نے احتیاط کی خاطر لگارکھی تھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اُنہوں نے آپ کو جمعرات کے روز رات کے وقت گرفتارکیا۔ رات کے وقت ہی جنرل کونسل کا

اجلاس منعقد کیا۔ رات کے وقت ہی مقدمہ کی سماعت شروع کی اوراُسی رات آپ کو مستوجبِ قتل قرار دے دیا۔ پس جہاں تک یہودی قانون کا تعلق ہے اس عدالت نے ابنِ اللہ کا خون نہ کیا بلکہ اپنے قانون کا خون کیا اور درحقیقت ابنِ اللہ مجرم نہیں تھے بلکہ آپ کے جج مجرم تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنرل کونسل کے ارکان کو جلدی کیا پڑی تھی کہ وہ شروع سے آخر تک قانون شکنی سے ذرا نہ جھجکے ؟ اس کی وجہ ہمیں بجز اس کے اورکوئی نظر نہیں آتی کہ عوام الناس اورہجوم کا مزاج پارہ کی طرح اورنیچے ہوتا رہتا ہے۔ چند روزپیشتر یہ لوگ حضرت ابنِ اللہ کے آگے آگے "ہوشعنا کے فلک شگاف نعرے بلند کررہے تھے اوراب یہی آپ کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ آپ کے ججوں کو یہ خوف دامنگیر تھا کہ مبادا ہجوم کوآپ کی نیکی ہمدردی اور محبت کےکام۔ آپ کے معجزات بینات اورکلماتِ طیبات یادآجائیں اورپیشمانی سے اس کے جذبات پلٹاکھا کرآپ سے ہمدردرانہ روش اختیارنہ کرلیں اوریوں اُن کی محنت اکارتھ جائے۔ پس اُنہوں نے اپنی خیراسی میں دیکھی کہ سب کام جلدی سے سرانجام پاجائیں خواہ اس تعجیل کی وجہ سے اُن کو یہودی قانون اورالٰہی شریعت کی الف سے لے کری تک خلاف ورزی کیوں نہ کرنی پڑے۔

(۶۔)

ابن اللہ کی گرفتاری کے بعد صدر مجلس اورارکانِ عدالت جمع ہوئے رات کے وقت مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی ۔ لیکن مقدمہ کی سماعت کی پہلی منزل میں یہ مشکل آن پڑی کہ حضرت ابنِ اللہ پرکس الزام کی بناء پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس میں رتی بھرشک نہیں کہ یہودی قانون کے مطابق یہ لازم تھا کہ دو گواہ عدالت کے پہلے یقین دلائیں کہ کسی شخص پر مقدمہ چل سکتا ہے۔ گواہوں کا بیان ہر مقدمہ کی روئداد کا شروع ہوتا تھا۔ اورجب تک یہ بیان علانیہ طورپر عدالت میں پہلے پیش نہ کیا جاتا اور عدالت کو یہ یقین نہ ہوجاتا کہ مقدمہ چلانا چاہیے تب تک مقدمہ شروع نہیں ہوسکتا تھا اورقانون کی نگاہ میں شخص مذکورنہ صرف بے گناہ سمجھا جاتا بلکہ وہ بے الزام تصورکیا جاتا تھا۔

عدالت نے گواہ بلائے۔ اوراُن کو ذیل کے نہایت سنجیدہ الفاظ میں مخاطب کیا گیا۔" اے گواہ یادرکھ کہ زندگی اورموت کے اس مقدمہ میں اگر تو گناہ کررہا ہے تو ملزم کا خون اوراُس کی اولاد کا خون ہمیشہ کےلئے تیری گردن پر ہوگا۔ آدم اسی لئے اکیلا پیدا کیا گیا تھا کہ تو جان جائے کہ اگر کوئی گواہ اسرائیل میں کسی ایک جان کو تباہ کرتا ہے توکتاب مقدس کے مطابق وہ دنیا کو برباد کرتا ہے اوراگر وہ اسرائیل میں کسی ایک کی جان بچاتا ہے تو وہ دنیا کو بچاتا ہے"۔

یہودی قانون کے مطابق کسی شخص پر الزام نہیں لگایا جاسکتا تاوقتیکہ دو گواہوں کا حلفیہ بیان متفقہ طورپر پیش ہوکر جج کو یقین نہ دلائے۔ لیکن ابنِ اللہ کے مقدمہ میں یہ مشکل درپیش ہوئی کہ گواہوں کے بیانوں میں تضاد اوراختلاف تھا اوراُن کے بیانوں میں کوئی ایسی متفق علیہ بات نہ تھی جس کی بناء پر زندگی اورموت کا مقدمہ چلایا جاسکتا۔ بڑی سے بڑی بات جوگواہوں نے کہی یہ تھی کہ ابنِ اللہ نے کہا تھاکہ" میں ہیکل کوگرا سکتاہوں اوراس کو تین دن میں کھڑا کرسکتاہوں " لیکن اس بیان کی بناء پرآپ پر صرف نقصِ امن کا مقدمہ چل سکتا تھا نہ کہ ایسا مقدمہ جس کی سزا موت ہو۔ پس قانون کی روح سے حضرت ابن اللہ شروع ہی سے نہ صرف بے گناہ تھے بلکہ بے الزام بھی تھے۔

(۷۔)

جب سردارکاہن کیفا اورعدالت کے ججوں نے دیکھا کہ کام بگڑتا ہے اوربات بنائے نہیں بنتی توانُہوں نے یہودی قانون کی دوسری پابندیوں کی باڑکو اکھاڑپھینکا اورقانون کی ایک اورخلاف ورزی کا ارتکاب کیاتاکہ کسی نہ کسی طرح ابنِ اللہ پر مقدمہ چل سکے۔ کیفا نے حضرت ابنِ اللہ سے سوال پوچھنے شروع کئے تاکہ آپ کے جوابات توڑ مروڑکر آپ کے خلاف کسی ایسے الزام کی بناء پرتلاش کی جاسکے جس کی سزا قتل ہو اور یہ اقدام یہودی قانون کے صریحاً خلاف تھا۔ یہودی قانون کی روُ سے آپ کے خلاف مقدمہ کی بناء صرف گواہوں کے بیان ہی سے شروع ہوسکتی تھی اوریہ بناء عدالت کو نہیں ملتی تھی لیکن عدالت کے جج اس بات پرتلے ہوئے تھے کہ" اُمت کی خاطر اس آدمی کا مرنا بہتر ہے"(یوحنا ۱۸: ۱۵)۔پس اُنہوں نے خود ابن اللہ سےسوال پوچھنے شروع کئے (یوحنا ۱۸: ۱۹)

تاکہ آپ کے بیان پر ہی مقدمہ کسی نہ کسی طرح شروع تو ہوسکے۔ لیکن حضرت ابن اللہ اُن کی چال کو تاڑ گئے۔ وہ بخوبی واقف تھے کہ آپ کے جج قانون کی خلاف ورزی اپنے وطیرہ سے کررہے ہیں پس آپ نے خاموشی اختیارکرلی(مرقس ۱۴: ۶۰، ۶۱ وغیرہ)۔لیکن آپ کے دشمن ججوں نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا اوروہ آپ سے سوال پر سوال کرتے گئے(یوحنا ۱۸: ۱۹) تب ابن اللہ نے مہر سکونت توڑی اورآپ نے جوکچھ فرمایا وہ نہ صرف انصاف پر مبنی تھا بلکہ یہودی قانون کے تقاضاؤں کے مطابق تھا چنانچہ آپ نے جواب دیا " میں نے دنیا سے علانیہ باتیں کی ہیں۔ میں نے ہمیشہ عبادت خانوں اورہیکل میں جہاں سب یہودی جمع ہوتے ہیں تعلیم دی اور پوشیدہ کچھ نہیں کہا۔ تومجھ سےکیوں پوچھتا ہے۔ سننےوالوں سے پوچھ کہ میں نے اُن سے کیا کہا۔ دیکھ اُن کو معلوم ہے کہ میں نے کیا کہا ہے (یوحنا ۱۸: ۲۰، ۲۱) حضرت ابن اللہ نے ان الفاظ میں یہودی قانونِ انصاف کی جانب اپیل کی تھی۔ اس پر آج جج برافروختہ ہوگئے اوریہودی تلماُٹھے اورآپ کو عدالت کے کمرہ میں ججوں کے سامنے طمانچہ مارا گیا جو سراسرا قانون کے خلاف تھا۔ اس حملہ کے جواب میں آپ نے پھر یہودی قانون کی پنا ڈھونڈھی اور دوبارہ انصاف کے خواہاں ہوئے اورفرمایا " اگرمیں نے کوئی ناجائز بات کہی ہے تواس برائی پر گواہی دے ۔ لیکن اگر میں نے درست کہا ہے تومجھے کیوں مارتا ہے؟(یوحنا ۱۸: ۲۳)۔

(۸۔)

جب عدالت نے دیکھا کہ کچھ بنتا نظر نہیں آتا اور مقدمہ کا آغاز بھی نہیں ہوسکتا تو صدرِعدالت سردارکاہن ایک اور چال چلا اوریہ چال بھی یہودی قانون کے سراسر خلاف تھی۔ اہل یہود اپنے قانون پرنازاں ہوکر فخریہ کہا کرتے تھے " ہمارا قانون کسی شخص کو اُس کے اپنے اقبال پر موت کی سزا نہیں دیتا"۔ یہودی قانون کے الفاظ بھی نہایت واضح تھے" ہمارا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر مقدمہ کے دوران میں کسی شخص کے منہ سےکوئی بات نکل جائے تو وہ بات اس کے خلاف استعمال نہیں کی جاسکتی" ۔ لیکن سردارکاہن نے اب یہ کوشش کی کہ خود حضرت ابن اللہ کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلوائے جس کی بناء پر نہ صرف آپ پر مقدمہ چل سکے

بلکہ آپ کو قتل کی سزا بھی مل سکے اس غرض کو مدِ نظر رکھ کر عدالت کے صدر نے آپ سے ایسے سوال پوچھنے شروع کئے جن کا جواب ابن اللہ کو دئیے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ سردار کاہن نے یہودی قانون کے بنیادی اصول کو بالائے طاق رکھ کر آپ سے پوچھا "کیا تو اس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے؟ اگر تو مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے" یہ سوال ایسا تھا کہ اس کا جواب ابن اللہ کو ضرور دینا تھا۔ اگر وہ اس کا جواب نہ دیتے تو اپنے مشن کا انکار کرتے پس آپ نے جواب میں فرمایا "ہاں میں ہوں" اور تم ابن آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے" جب سردار کاہن نے دیکھا کہ اس کی چال کارگر ہوگئی ہے۔ اُس نے اپنے کپڑے پھاڑ کر کہا "اب ہمیں گواہی کی کوئی حاجت نہیں۔ تم نے یہ کفر سنا۔ تمہاری کیا رائے ہے" صدر عدالت کے تمام ارکان یہودی قانون کے بنیادی اصول کو بھول گئے کہ "اگر مقدمہ کے دوران میں کسی شخص کے منہ سے کوئی بات نکل جائے جو اُس کے خلاف ہو تو وہ بات اس کے خلاف متصور نہیں کی جاسکتی"۔ "ہمارا قانون کسی شخص کو اُس کے اپنے اقبال پر موت کی سزا نہیں دیتا" سردار کاہن کے سوال کے جواب میں اُنہوں نے کہا "اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی؟ ہم نے خود اس کے منہ سے سن لیا ہے"۔ ان سب نے فتویٰ دیا کہ حضرت ابن اللہ قتل کے لائق ہے۔ کیونکہ یہودی قانون کے مطابق کفر کی سزا موت ہے۔

سیدنا مسیح کی صلیبی موت اور رومی قانون

(۱۔)

سردار کاہن کیفا یہودی تھا جو مسیح موعود کی آمد کی منتظر تھا ۔ پس اُس کا ایک دوسرے یہودی (ابن اللہ) سے یہ سوال کرنا" کیا تو خداکا بیٹا مسیح ہے" ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابن اللہ پریہ الزام نہیں لگاتا۔ کہ آپ نے مسیح موعود کی آمد کے متعلق کوئی انوکھی یا نئی تعلیم یا بدعت شروع کی ہے بلکہ اُس کے سوال کا مطلب یہ ہے" کیا توہی وہ مسیح ہے جس کی ہماری قوم منتظر ہے۔ اورجس کی پیش خبری ہمارے انبیاء نے دی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا" ہاں میں ہوں" صدر عدالت والے اب اس انتظار میں تھے کہ آپ ان کو اپنا پروگرام بتلائیں جس کے مطابق آپ رومی سلطنت کو برباد کرکے یہودی حکومت کوازسرنو قائم کرینگے کیونکہ اُن کے خیال میں مسیح موعود کا بس یہی ایک کام تھا۔لیکن صدرعدالت کے سامنے آپ کی زبان مبارک سے ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلا جس میں آپ نے دینوی بادشاہت کا دعویٰ کیاہو۔ یا تلوار کے ذریعہ رومی سلطنت کو مغلوب کرنے کے خیال کا حامل ہو۔ اس کے برعکس آپ نے روحانی دنیا اورالہٰی قربت کا ان کے سامنے ذکر چھیڑا۔ لیکن اگرآپ نے باغیانہ خیالا ت کا ذرا بھی اظہار فرمایاہوتا توآپ پر نہ صرف توکفر کا فتویٰ صادرہوتا اورنہ صلیبی موت کی نوبت آتی بلکہ سردار کاہن اور صدرعدالت کے ارکان آپ کو اپنی سیاسی اغراض کاآلہ کاربنا لیتے ۔ تاکہ آپ کے اثر ورسوخ اور اعجازی قواء کے ذریعہ یہودی سلطنت کو ازسرنو قائم کریں۔ ابن اللہ کے جواب سے اورآپ کی معنی خیز خاموشی کودیکھ کر صدرِعدالت والے مایوس ہوگئے ۔ کیونکہ آپ نے اُن کی تمام اُمیدوں پر جو وہ مسیح موعود کی ذات کے ساتھ وابستہ کرتے تھے پانی پھیردیا۔ ان کے دل ودماغ میں احیائے قوم کا خیال سمایاہوا تھا۔ اوراگر کوئی امر اس کے حصول کی راہ میں مانع ہوتا تو اس رکاوٹ کو پاؤں تلے بیدریغ روندنے میں اُن کو ذرا باک نہ تھا۔ جب اُنہوں نے دیکھ کر ابن اللہ کا وطیرہ اُن کے زعم کے مطابق قوم کے مفاد کے خلاف ہے تو اُنہوں نے تہیہ کرلیاکہ بقائے

قوم کی خاطر اُس کو قتل کرنا ہی بہتر ہے(یوحنا ۱۱: ۵۰) صدر عدالت کے فتوےٰ کے مطابق ابن اللہ نے "کفر بکا" لیکن کیا آپ کا جواب صحائف انبیاء کی کتب اوربالخصوص حضرت یسعیاہ نبی کی کتاب کے دوسرے حصہ (ابواب ۴۰تا ۶۶) کے مطابق نہ تھا؟ یہ درست ہے کہ آپ کا ارشاد سردار کاہن اور صدرِعدالت والوں کے خیالات وجذبات کے منافی تھا لیکن کیا محض اس بناء پر وہ "کفر" قرار دیا جاسکتا تھا؟ عدالت کےکسی رکن نے ان باتوں کی تفتیش کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اورکتاب مقدس اوریہودی قانون کی ایک اور خلاف ورزی کرکے آپ کوواجب القتل قراردے کر رومی سلطنت کے گورنر پلاطوس کے سامنے پیش کردیا۔

(۲-)

سردار کاہن کیفا گورنر پلاطوس کے لگے پچھلے حالات سے واقف تھا اوراُس کو خوب پہچانتا تھا۔ پلاطوس بھی کیفا کے ہتھکنڈوں کو جانتا تھا اوراُس کی چالبازطبیعت سے واقف تھا۔ پلاطوس کو پچھلا ریکارڈ خراب تھا۔ وہ قیصر طبریاس کا گورنر اور وائسرے تھا اور ارضِ مقدس میں ٹھیک اُسی طرح حکومت کے اختیارات رکھتا تھا جس طرح برطانیہ کے بادشاہ کا وائسرے ہمارے ملک میں رکھتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی حکومت کے دوران میں چند باتیں ایسی کی تھیں جو اُس کے خلاف تھیں۔ مثلاً مشتے نمونہ از خروارے وہ یہودیت کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اوریہودی اداروں کا جانی دشمن تھا۔ یہودی مورخ یوسیفس ہم کو بتلاتا ہے کہ وہ " یہودی شریعت " کو مٹانے کی خاطر" فوج کو قیصر یہ سے یروشلیم لے آیا تھا۔ شہر یروشلیم میں ہر قسم کی مورت کا داخلہ موسوی شریعت کے دوسرے حکم کے مطابق ممنوع تھا لیکن وہ رومی پرچم کو اُس کے اندر لے گیا۔ جس پر قیصر روم کی مورت تھی ۔ اس پر تمام شہر میں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ پلاطوس نے سپاہیوں کوحکم دیاکہ ہجوم کو چاروں طرف سے گھیرلیں۔اہلِ یہود کی بھیڑوں کی بھیڑیں زمین پر لیٹ گئیں اوراُنہوں نے کہا کہ ہمیں موت قبول ہے لیکن ہم رومی جھنڈے کی مورت سے اپنے شہر کو ناپاک ہونے نہ دینگے۔ اس پر پلاطوس جھک گیا۔ سردار کاہن کو یہ موقعہ خوب یاد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پلاطوس کی ہجوم کی رائے عامہ

کے ذریعہ جھکایا جاسکتا ہے ۔ اور وہ اس موقعہ پر بھی یہی چال چلا چنانچہ مقدس مرقس لکھتے ہیں" سردار کاہنوں نے بھی یہی چال چلاچنانچہ مقدس مرقس لکھتے ہیں" سردار کاہنوں نے بھیڑ کو ابھارا ۔۔۔اور وہ چلائے کہ اُسے صلیب دے۔۔۔ وہ اوربھی چلائے کہ اُسے صلیب دے۔ پلاطوس نے لوگوں کو خوش کرنے کے ارادہ سے ۔۔۔الخ (۱۵: ۱۱تا ۱۵)۔ اورمقدس لوقا لکھتے ہیں" وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اُسے صلیب دی جائے اوراُن کا چلانا کارگرہوا(۲۳: ۲۳)۔

ایک اورموقعہ پر لوکل سیلف گورنمنٹ کے سوال پر اہل یہود اورپلاطوس میں جھگڑا برپا ہوا تھا۔ اُس نے یروشلیم کے شہر میں پانی کی آمد کا ایسا اچھا انتظام کیا تھا کہ بادشاہ سلیمان کے بعد باوجود ہزارکوششوں کے کوئی نہ کرسکا تھا۔ اس انتظام کے اخراجات کوپورا کرنے کی خاطر اُس نے ہیکل کے خزانہ پر ہاتھ ڈالا۔اس موقعہ پر تمام شہر میں فساد مچ گیا۔ پلاطوس نے رومی فوج کے سپاہیوں کو حکم دیاکہ یہودیوں کا سالباس پہن کربلوائیوں میں رل مل جائیں اوراُن کو خنجروں سے موت کے گھاٹ اُتاردیں۔ یوں اُس نے قتلِ عام اورخونریزی کے ذریعہ فساد فرد کردیا۔

ان اوردیگراُمورکی وجہ سے یہودی پلاطوس سے سخت شاکی تھے پلاطوس بھی باطن میں اپنے پچھلے کارناموں کی وجہ سے ان سے خائف وہراساں رہتا تھا۔ اُس کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ " اُس زمانہ میں رومی قانون کی روُ سے رُومی قیصر سلطنت کے ہر شبعہ کا خود مختارسر تھا۔اورسیاسی مذہبی فوجی اور ریاستی امورسب کے سب اُس کے ہاتھ میں تھے۔ اوروہ جو چاہتا مطلق العنان ہونے کی وجہ سے کرسکتا تھا۔ اگر قیصر چاہتا تو ہر چھوٹے بڑے شخص کو معمولی سے معمولی قصور کے عوض یا صوبہ کی بدانتظامی کی وجہ سے عمر قید یاموت کی سزا دے دیتا تھا۔ اوراگر کہیں قیصر کو یہ اندیشہ ہوجاتا کہ فلاں شخص میرا " خیر خواہ" نہیں ہے تو ایسی خطرناک غداری کی سزا بدترین اور سخت ترین موت ہوتی تھی۔ سردار کاہن کیفا اس امر سے بھی بخوبی واقف تھا پس اُس نے نہایت چالا کی سے اس ہتھیارکوبھی پلاطوس کے خلاف استعمال کیا۔ چنانچہ مقدس یوحنا لکھتے ہیں " یہودیوں

نے چلا کر کہا ۔ اگر تو اُس کو چھوڑدیتا ہے تو قیصر کا خیر خواہ نہیں" (۱۹: ۱۲)۔

سطورِ بالا سے ناظرین پر ظاہر ہوگیا ہوگا کہ سردار کاہن کیفا اورگورنر پلاطوس کس قماش کے انسان تھے۔ دونوں کا شیوہ چالبازی تھا۔ دونوں حصولِ مقصد اور مطب براری کی خاطر ہر قسم کی چال چل لیتے تھے عامیانہ زبان میں دونو" چارسوبیس کھیلنے" میں مشاق تھے" لیکن دونوں میں سے کیفا زیادہ ہشیاراورچالاک تھا۔ ہر ہشیار شخص کیفا کی سی خوبی کے ساتھ ان شطرنجی چالوں کو نہ چل سکتا۔

(۳۔)

اب مقدمہ یہودی عدالت سے رومی عدالت میں منتقل ہوگیا۔ یہودی صدرِ عدالت سنہیڈرن کا پریذیڈنٹ سردارکاہن کیفا تھا۔ رومی عدالت کا صدرگورنر پلاطوس تھا۔ جوپری ٹوریم (Pretorium) میں بحیثیت قیصر طبریاس (جورومی مذہب کا سردارکاہن تھا) کے وائسرے ہونے کے تخت عدالت پر متکمن تھا۔ یہاں یہ سوال پیداہوتا ہے کہ قانون کی نظر میں دونوں عدالتوں کی کیا حیثیت تھی اوران کا باہمی تعلق کیا تھا؟قیصر روم کی حکومت سے پہلے سنہیڈرن کو یہ اختیارحاصل تھا کہ وہ موت کا فتوےٰ صادرکرنے کے بعد خود ہی موت کی سزا بھی دیدے۔ لیکن جب ملکِ قیصر روم کے ماتحت ہوگیا تو سنہیڈرن سے موت کی سزا دینے کا اختیار چھین لیا گیا ۔ کیونکہ ہر یہودی ملزم قیصرِ روم کی رعیت تھا۔ پس اس کو بحیثیت رعایا ہونے یہ حق حاصل ہوگیا تھا کہ قیصر کے نمائندے اور رومی قانون کی پناہ میں ہو۔ یہودی عدالت میں مقدمہ کی سماعت جو کی گئی تھی وہ موت کے فتویٰ صادر ہونے تک سنہیڈرن کے اختیارمیں تھی لیکن یہ سماعت فتوےٰ کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھی۔ موت کی سزا دینا قیصرِ روم کے نمائندے کے ہاتھ میں تھا(یوحنا ۱۸: ۳۱)۔

ہم کویادرکھنا چاہیے کہ جب مقدمہ پلاطوس کے سامنے آیاتو وہ سنہیڈرن کے فیصلہ کے خلاف اپیل کے طورپر نہیں آیا تھا۔ رومی عدالت کوئی کورٹ آف اپیل (Court of Appeal) نہ تھی۔ اورنہ سیدنا مسیح نے سنہیڈرن کے فیصلہ کے خلاف رومی عدالت میں کوئی اپیل دائر کی تھی۔ لیکن اس

کے ساتھ ہی پلاطوس کی حیثیت کسی ایگزیکٹو آفیسر کی سی نہ تھی۔ جس کا کام یہ ہو کہ سنہیڈرن کے فیصلہ کو بے چون وچرا پورا کرکے ملزم کو مروا ڈالے۔ پلاطوس کے اختیار میں تھا کہ وہ مقدمہ کی روئداد کی دیکھ بھال کرے۔ رومی قانون کی رو سے اُس پر مقدمہ کی نگرانی کرنی لازم تھی۔ ان دونوں عدالتوں کے باہمی تعلقات کی نظیر موجودہ زمانہ میں غالباً ہندوستان کی ہائی کورٹ اورپریوی کونسل کی جوڈیشنل کمیٹی (Judicial Committee of the Privy Council) کے باہمی تعلقات میں پائی جاتی ہے یہ کمیٹی بارباراس پر اصرارکرتی تھی کہ وہ کورٹ آف کریمنل اپیل (Court of Criminal Appeal) نہیں ہے ۔ تاہم اس کو یہ اختیار حاصل تھاکہ وہ اس امر کا خیال رکھے کہ کسی وجہ سے انصاف کا خون نہ ہونے پائے۔

بعینہ یہی اختیار پلاطوس کو بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ اس کو دیگر اختیارات بھی حاصل تھے۔ مقدمہ میں وہ نہ صرف طرفین کے بیان سن سکتا تھا بلکہ وہ خود ملزم سے سوالات کرکے اصل حقیقت کو معلوم کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اُس کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ خود گواہوں کو بلواکر معاملہ کی تہ تک پہنچے۔ وہ یہودی صدر عدالت سنہیڈرن کے فیصلہ کو بھی برطرف کرسکتا تھا۔ اور سزائے موت کو برطرف کرکے سزا میں تخفیف کرسکتا تھا یا ملزم کو بری قرار دے کراُس کو آزاد کرسکتا تھا۔

ہم کو یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ پلاطوس چیف جج ہونے کے علاوہ گورنر اورحاکم بھی تھا اور صوبہ کے امن عامہ کے تحفظ کا ذمہ دار تھا۔اُس کا نہ صرف یہ کام تھا کہ عدالت کی کُرسی پر بیٹھ کر انصاف کرے بلکہ اُس کا یہ بھی فرض تھا کہ صوبہ کا بہترین طورپر انتظام کرے۔ وہ نہ صرف چیف جسٹس تھابلکہ لاء اورآرڈر(Law & Order) کا ہیڈ تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس کی مثال کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی سی ہے۔ جو نہ صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوتا ہے بلکہ ضلع کا ایگزیکٹو افسر بھی ہوتا ہے۔ پلاطوس کی ذات میں جوڈیشنری اور ایگزیکٹو (Judiciary & Executive) اختیارات دونوں جمع تھے۔ پس اس کا یہ کام تھا کہ وہ نہ صرف ملزم کے ساتھ انصاف کرے بلکہ اگر وہ مقدمہ میں کسی قسم کی خامی دیکھے تواُس کو یا بری کردے یا سزا میں تخفیف کردے اورامن

عامہ کو سامنے رکھ کر ملزم کی حفاظت کی تدابیر کو عمل میں لائے تاکہ وہ مقامی مفسدوں سے رومی قانون کی پناہ میں رہے۔

لیکن ان حفاظتی تدابیر سے پہلے ضروری تھا کہ پلاطوس مقدمہ کی تہ کو پہنچ کر دریافت کرے کہ آیا ملزم بے گناہ ہے یا نہیں۔ اوراگریہ ثابت ہوجائے کہ وہ بےقصور ہے تواُس کو بری کردے ورنہ اُس کی موت رومی سلطنت کے انصاف کے دامن پر نہ مٹنے والے خون کا دھبہ ہوگی۔

(۴۔)

مبارک جمعہ کے روز جب پلاطوس عدالت کی کُرسی پر بیٹھا تو یہودیوں کی طرف سے سردارکاہن کائفا ،ابن اللہ کو مجرم قرار دے کر اُس کے سامنے لایا۔ اور درخواست کی کہ اس کو فوراً سزائے موت دی جائے کیونکہ اُن کی عید فسح کی صبح ہے۔ اس پر پلاطوس چوکنا ہوگیا۔ اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہواکہ اس کے پاس دستور کے خلاف عیدِ فسح کے دن جب یہودی قانون کے مطابق اس قسم کی کارروائی کرنا منع تھی ایک ایسا مقدمہ کیوں لایا گیا ہے جس میں ملزم کو مستوجبِ قتل قرار دیاگیا ہے اور سردار کاہن نے کیوں یہ درخواست کی ہے کہ اُس کو فوراً سزا دی جائے۔اورمقدمہ کی روئداد یہودی قانون اوردستور کے خلاف کیوں عید سے پہلے کی شام کو مکمل کی گئی ۔ جب یہودی قانون کے الفاظ واضح ہیں کہ " اس قسم کے مقدمہ کی سماعت سبت سے پہلے کی شام کو یاکسی عید تہوار سے پہلے کی شام کو نہ ہو"۔ علاوہ ازیں مقدمہ کی سماعت کے دوران میں اس کو معلوم ہوگیاکہ سنہیڈرن نے یہودی شریعت وقانون کی سب پابندیوں کو بے دریغ توڑا ہے ۔ پس اُس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اصل معاملہ کو معلوم کرکے انصاف کرے گا۔ اناجیل کے بیان کے مطابق مقدمہ کے دوران میں اُس نے ہر طرح سے کوشش کی کہ وہ انصاف کو مدِنظر رکھ کر اپنا فیصلہ دے۔ اُس کو بحیثیت جج اورگورنر ہونے کے نہ صرف اپنے فرائض کا احساس تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ قیصر روم کے پاس اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا جواب دہ ہے۔ پلاطوس کے ذہنی فیصلہ کو اُس نظارہ سے بھی تقویت ملی جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ایک طرف یہودی ہجوم کا بے پناہ جوش وخروش اور

سردارکاہن جیسی مقتدرہستی کا ہونا اوردوسری طرف ایک بیکس ولاچاراوربے یارتن تنہا ملزم جس کا نہ کوئی دوست تھا اورنہ صفائی کا گواہ جواس آڑے وقت اُس کے کام آتا۔ لیکن پلاطوس یہ بھی دیکھتا تھاکہ ملزم پریہودی ہجوم کے جوش کا کوئی اثر نظرنہیں آتا تھا۔ اورنہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی تھیں۔ وہ نہایت اطمینان اورشانتی کے ساتھ کھڑا تھا۔ بھیڑ کے لوگ اُس پرآوازے کستے تھے لیکن وہ سکون سے سب دلخراش باتیں سنتا تھا اورصبراورمحبت سے برداشت کئے جاتا تھا۔ ان حالات میں یہ ناممکن اورغیر فطرتی بات ہوتی اگرجج کی ہمدردی ملزم کے ساتھ نہ ہوتی۔ پلاطوس نے مصمم ارادہ کرلیاکہ وہ ملزم کے ساتھ انصاف برتے گا۔

(۵۔)

گورنر پلاطوس سردارکاہن کائفا کے ہتھکنڈوں سے واقف تھا۔ اُس نے بھانپ لیا کہ وہ ہجوم کو اس غرض سے اپنے ہمراہ لایا ہے کہ پہلے کی طرح اُس کومرغوب کرلے۔ پس اُس نے سردارکاہن کوترُشی سے مخاطب کرکے پوچھا" تم اُس پرکیا الزام لگاتے ہو؟" سردارکاہن نے گستاخانہ جواب دیا۔ " اگریہ قصوروارنہ ہوتا توہم کوکیا ضرورت پڑی تھی کہ اسکو آج کے دن تیرے پاس لاتے"(یوحنا ۱۸: ۱۹) سردارکاہن کے جواب سے (جودرحقیقت نہ کوئی ثبوت تھا اورنہ کوئی الزام تھا) پلاطوس کو معلوم ہوگیا کہ ملزم کے خلاف درحقیقت کوئی الزام نہیں ہے۔ انجیلی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار کاہن کو پلاطوس کی عدالت میں بھی وہی مشکل درپیش آئی جو اس کو اپنی عدالت میں پیش آئی تھی ۔ یعنی ابن اللہ کے خلاف کوئی خاص الزام نہیں لگا تھا جو کسی عدالت میں مقدمہ کی بنا ہوسکتا ہو۔ پس سردارکاہن ایک نئی چال چلا۔ اُس نے ابن اللہ پرتین الزام لگادئیے جن کا اُس کی اپنی عدالت میں ذکرتک نہ ہوا تھا اورنہ ان کی بناء پرآپ پر موت کا فتویٰ لگایا گیا تھا۔ اُس نے کذب بیانی کرکے گورنر کو کہا کہ ہماری عدالت نے تین اُمورکی بنا پراس کو واجب القتل قراردیا(۱) یہ شخص قوم یہود کوبہکاتا ہے۔ وہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یروشلیم تک لوگوں کو سکھا سکھا کراُبھارتا ہے(۲) وہ قیصر کو خراج دینے سے منع کرتا ہے(۳)وہ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ مسیح کہتا ہے(لوقا ۲۳: ۲تا ۵)۔ جب

سردارکاہن ابن اللہ پر الزام لگا چکا توپلاطوس نے مقدمہ کی تفتیش شروع کردی۔ سردارکاہن نے گواہ پیش کئے لیکن ملزم نے نہ تو گواہوں کی جرح کی اورنہ اُن کی گواہی سے مرعوب ہوکر ہراساں ہوا۔ بلکہ رُعب آمیز خاموشی سے چپکا اُن کے الزام اوربیانات سنتا رہا۔ جج کے دیکھنے میں ایسی بات کبھی نہ آئی تھی۔ اوروہ ابن اللہ کے وطیرے سے حیران اورششدر رہ گیا (متی ۲۷: ۱۴)۔

مقدمہ کی سماعت کے دوران میں گواہوں کی شہادت نے پلاطوس پریہ ظاہر کردیاکہ ابن اللہ کے خلاف درحقیقت کوئی ٹھوس الزام نہیں ہے۔ جس کی بناء پر اس پر مقدمہ چل سکے۔ کیونکہ پہلا الزام کہ ابنِ اللہ قوم کو گمراہ کرتے رہے ہیں صریحاً مذہب کے ساتھ تعلق رکھتا تھا جس کا نہ تو سیاسیات کے ساتھ کوئی واسطہ تھا اورنہ اُس کی سزا قتل تھی۔ دوسرا الزام کہ ابن اللہ قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے تھے بے سروپا تھا۔ کیونکہ گواہوں کی شہادت ثابت کرتی تھی کہ اس قسم کا الزام آپ کی تعلیم اورعم دونوں کے خلاف ہے۔ پلاطوس یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس الزام میں کچھ صداقت ہوتی تو سردارکاہن ابن اللہ کو موردِ الزام نہ گردانتا اورنہ آپ کو رومی عدالت میں پیش کرتا ۔ اوریہ بات سچ بھی تھی۔ کیونکہ اگر ابن اللہ فی الحقیقت باغی ہوتے توجیسا ہم کہہ چکے ہیں روسا ئے یہود آپ کو اپنی سیاسی اغراض کا آلہ کاربنالیتے۔ آپ سے اگر اُن کو کوئی شکایت تھی تویہ تھی کہ آپ رومی سلطنت سے بغاوت کی تلقین نہیں کرتے تھے۔ سردارکاہن نے اپنے حصولِ مطلب کےلئے یہ الزام تولگادیا کہ آپ باغی خیالات کے انسان ہیں۔ لیکن درحقیقت اُن کی شکایت یہ تھی کہ آپ باغی نہیں۔ پلاطوس بھی اس رمز کو بھانپ گیا۔ پس اُس نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ دوسرا الزام بھی ثابت نہیں۔

تیسرا الزام نہایت سنگین تھاکہ آپ نے بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ چاروں انجیلیں اس بات پر متفق ہیں کہ پلاطوس نے اس سنگین الزام کی اچھی طرح تفتیش کی۔ اُس نے ابن اللہ سے پوچھا" کیا تویہودیوں کا بادشاہ ہے"؟ آپ نے جواب میں فرمایا" تو خود کہتا ہے" جس کا یہودی قانون کے مطابق یہ مطلب تھا کہ تواپنے قول کو ثابت کر۔ گواہوں کو طلب کر اور تصدیق کرلے۔ چونکہ معاملہ سنگین تھا پلاطوس

پر لازم ہوا کہ وہ اس بات کی تہ کو پہنچے ۔ پس وہ آپ کو اندر پری ٹوریئم میں لے گیا تاکہ خلوت میں اصل حالات کو دریافت کرے۔ عید فسح کی صبح ہونے کی وجہ سے سردار کاہن اوریہود ناپاک ہوجانے کے خدشہ سے اندر نہ گئے۔ وہاں قلعہ کے اندر خلوت میں جج او رملزم کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ دنیا کے مشہور مقدمات میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ چنانچہ مقد س یوحنالکھتے ہیں ۔پلاطوس نے پوچھاکہ کیا تویہودیوں کا بادشاہ ہے۔ یسوع نے جواب دیا میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر میری بادشاہت دنیا کی ہوتی تومیرے خادم لڑتے۔ پلاطوس نے اُس سے کہا۔ کیا تو بادشاہ ہے یسوع نے جواب دیا میں اس لئے پیدا ہوا ہوں اور اس لئے دنیا میں آیا ہوں کہ حق کی گواہی دوں جو کوئی سچائی کا ہے وہ میری آوازسنتا ہے ۔ پلاطوس نے اُس سے کہا سچائی کیا ہے ؟(۱۸: ۳۳۔ ۳۸)۔ انجیل کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس خلوتی ملاقات میں گورنر نے اپنی حکومت اوراختیار کو برطرف کرکے ابن اللہ سے سوال کئے۔ اورآپ نے اس کو عقیل وفہیم رومی اورفراخ نظر انسان خیال کرکے جواب دئیے۔ آپ نے اس کو عالمِ بالا کی ایک نئی دنیا کا نظارہ دکھایا جو اب تک اُس کی نظروں سے اوجھل رہا تھا۔ آپ نے فرمایا " ہاں میں بادشاہ ہوں لیکن اس دنیاکی بادشاہی کا دعویدارنہیں ہوں۔ ایک اوردنیا ہے۔ جو دنیائے حق ہے میں اس کا تاجدارہوں۔ اورجو حق کی پیروی کرتا ہے وہ میرا غلام ہے۔ اورمیں اس کا آقاہوں۔" اس جواب سے پلاطوس پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ ابن اللہ قیصر روم کے رقیب یا حریف نہیں ہیں اور دینوی سلطنت کا خیال بھی آپ کے دل میں کبھی نہیں آیا۔ کیونکہ اگر آپ باغی ہوتے تو ظاہر ہے کہ آپ کے پیرو آپ کی خاطر جنگ اورخونریزی کرتے اورآپ اس بے سروسامانی کی حالت میں نہ ہوتے۔ اس نے سوچا کہ ملزم سچ کہتا ہے۔ اوراُس نے یہ کہا بھی ہے کہ" میں سچ کی گواہی دیتاہوں" اورجو کوئی سچائی کا ہے وہ میری پیروی کرتا ہے"۔ ان الفاظ نے جج کو متاثر کردیا۔ پلاطوس کے خیالات نے ایسی فضا میں پرورش پائی تھی جو قیصر طبریاس کے دربارکی تھی جہاں کوئی شخص رومی مذہب کے بُتوں کا قائل نہ تھا جو امُرائے دربارکی نظر میں بے حقیقت تھے۔ روسائے سلطنت کا اصل مذہب

حب الوطنی اورامپریل ازم (Imperialism) کی پرستش تھا۔ قیصر روم جو سلطنت کی عظمت کا زندہ نشان تھا حقیقی دیوتا تھا جس کی سب چھوٹے بڑے پرستش کرتے تھے۔ جو شخص قیصر پرستی نہیں کرتا تھا وہ سلطنت کا دشمن اورغدار تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اس قسم کی پرستش انسان کی روح کو اُوپر نہیں اٹھاسکتی ۔ اورنہ اس کی روحانی تقاضاؤں کی پیاس کو بجھا سکتی ہے۔ ابن اللہ نے پلاطوس کو فرمایا تھا کہ میرا پیدائشی حق ہے کہ میں حق اورسچائی کی سلطنت کا تاجدارہوں اور میری آمد کا مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا کو حق کی طرف دعوت دوں۔پلاطوس دل میں سوچتا تھا کہ آخر یہ حق کیا چیز ہے سچائی کس کو کہتے ہیں جس کی اس شخص کے مطابق پیروی کرنی ہر انسان پر لازم ہے ۔ تاکہ اس کی روح اس مادی دنیا سے بالا تر ہوسکے۔ یہ نئی تعلیم کیا ہے جو یہ شخص دیتا ہے۔ اگر اس نئی تعلیم میں سچائی ہے تو وہ سب پُرانے خیالات جن میں میری پرورش ہوئی ہے باطل ہیں۔ بہرحال اس نئی تعلیم کا بغاوت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں اورنہ یہ تعلیم رومی سلطنت کے قانون کے خلاف ہے۔ملزم محض ایک خواب بین ہے جس نے حق کے اصول کو اپنی عملی زندگی کی روشنی بنارکھا ہے۔وہ اپنے حق کے اصول کی خاطر جان دینے کو بھی تیار ہے۔ ایسے شخص کا خون کرنا عدل اورانصاف کا خون کرنا ہے اوریہ ایک ایسی بھیانک بات ہے کہ میں اس کا ہرگز مرتکب نہ ہوگا"۔ پس پلاطوس یہودیوں کے پاس پھر باہر گیا اوراُن سے کہا کہ میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا"(یوحنا ۱۸: ۳۸)۔

رومی حکومت میں مقدمہ ختم ہوگیا۔ چیف جسٹس نے حکم سنادیا۔ " میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا"۔ رومی سلطنت کے قوانین کے مطابق ابنِ اللہ بری قرارپائے۔

منجئی عالمین کی صلیبی موت اور مسئلہ تقدیر

ایک صاحب لکھتے ہیں " آپ نے اپنی کتاب (دین فطرت ۔اسلام یا مسیحیت؟) میں لکھا ہے کہ قرآنی آیات میں نہایت واضح طورپر قسمت اور تقدیر کو مانا گیا ہے لیکن انجیل تقدیر کی قائل نہیں۔ اگریہ درست ہے تو مسیح کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ " ابنِ آدم توجیسا اُس کے حق میں لکھا ہے جاتاہی ہے لیکن اُس آدمی پر افسوس جس کے وسیلہ سے ابنِ آدم پکڑوایا جاتاہے۔ اگر وہ آدمی پیدا نہ ہوتا تو اُس کےلئے اچھا ہوتا" (متی ۲۶: ۲۴)۔

جواباً عرض ہے کہ اس دنیا میں دو قسم کےانسان ہوتے ہیں۔ایک قسم کے آدمی وہ سعید انسان ہیں جو ہر حالت میں مشیتِ ایزدی اورنیکی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم کے آدمی کجرو،بدکار، بدمعاش اور ستم شعار ہوتے ہیں جن میں بدی اورشرارت فطرتِ ثانی بن چکی ہے۔ پہلی قسم کے انسان نہایت حوصلہ مندی اوراستقلال سے اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں صرف اُن اُمورکو سرانجام دینا چاہتے ہیں جو رضائے الہٰی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اُن کو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی کہ خدا کی مرضی کو پورا کرنے میں اُن کو بدی کی طاقتوں سے ناسازگار حالات سے اور غیر موافق ماحول سے جان توڑ مقابلہ کرنا پڑیگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہرچہ باداباد۔ ہم خدا سے توفیق حاصل کرکے ہر قسم کی رکاوٹ پر غالب آئینگے۔ اُن کو اس بات کی رتی بھر پرواہ نہیں ہوتی کہ عوام الناس اُنکے خلاف ہیں یا حکومت اوربادشاہ ان کے خلاف پرے باندھے ہیں۔ اُن کو اپنے انجام کا بھی مطلق خیال نہیں ہوتا۔ ایسے مستقل مزاج سعید انسان روزانہ دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ کروڑوں آدمیوں میں کبھی کبھار نظر آتے ہیں۔ اوریہی انسان درحقیقت زمین کا نمک اوردنیا کا نورہوتے ہیں۔ جب اس قسم کے انسان بے دھڑک ہوکر نیکی کی راہ پر چلتے ہیں۔ تواُن کا کج روبدکرداروں کے ساتھ تصادم ہوجانا ایک قدرتی لازمی اوراٹل بات ہوجاتی ہے۔ اورہر شخص جس میں ذرا بھی سوجھ بوجھ ہے بے تامل کہہ دیتا ہے کہ سعید اورصالح انسان کی زندگی دکھ اور مصیبت کا ایک لامتناہی سلسلہ رہیگی۔ اوراگر اس نے بدی کی طاقتوں سے رواداری اختیار نہ کرلی تواُس کے حق میں اچھا نہ ہوگا بلکہ اس کا انجام بربادی

اور موت ہوگا۔ اس قول سے اُس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صالح آدمی کی قسمت اور تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ اُس کا انجام موت ہے بلکہ اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے موجودہ حالات میں جب نیکی اور بدی کی طاقتوں کی آپس میں ٹکر ہوجاتی ہے تونیک انسان کو اپنے اصولوں پر ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی وجہ سے مخالفت بدسلوکی، اذیت ، مصیبت اور موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(۲۔)

اس قسم کے صالح انسانوں کی مثال ہم کو انبیائے عظام کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت کلمتہ اللہ کا ارشاد ہے" کوئی نبی اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا "(لوقا۴: ۲۴)۔" لوگوں نے نبیوں کو ستایا"(متی ۵: ۱۲)" اورتم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو'(متی ۲۳: ۳۲)" اے یروشلیم تو نبیوں کو قتل کرتی ہے۔اورجوتیرے پاس بھیجے گئے اُن کو سنگسارکرتی ہے"(متی ۲۳: ۳۷)۔ ابن اللہ نے انبیائے یہود کی زندگیوں سے یہ سبق سیکھا تھا کہ جو شخص رضائے الہٰی کو اپنا کھانا اورپینا سمجھتا ہے اور بے خوف وہراس خدا کی مرضی کو اُس کے بندگان پر کماحقہ ظاہر کرتا ہے اُس کی زندگی پھولوں کی سیج ہونے کی بجائے ایک پُر خطر راہ ہوتی ہے۔جو کانٹوں سے بچھی ہوتی ہے۔ اورموت اور قتل اُس کا انجام ہوتا ہے۔ انجیل جلیل کا مطالعہ ہم پر ظاہر کردیتا ہے کہ حضرت کلمتہ اللہ نے یسعیاہ نبی کے دوسرے حصہ(ابواب چالیس تاآخر) کا بخوبی غوراورتدبر کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ آپ ان تمام مقامات کا اطلاق اپنے اوُپر کرتے تھے جن میں" خدا کے راستباز خادم" کا ذکر آتا ہے۔ آپ کو بخوبی علم تھا کہ آپ کا اُس راستباز خادم کا حشر ہوگا یعنی اُس برہ کا سا ہوگا" جسے ذبح کرنے لے جاتے ہیں"اورآپ کو " اپنی جان موت کے لئے " انڈیل " دینی پڑیگی۔حضرت یوحنا بپتسمہ دینے والے کا نمونہ آپ کی نظروں کے سامنے تھا۔ جس کو راستبازی پر عمل کرنے کی خاطر اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے(متی ۱۴باب)آپ نے اپنی سہ سالہ تبلیغی خدمت کے دوران میں اس ٹکر کا نتیجہ خود دیکھ لیا تھا۔ اور فریسیوں ، فقیہوں ، ربیوں ، کاہنوں اور سردار کاہنوں بلکہ بادشاہ ہیرودیس سے بھی مخالفت سہیڑلی تھی(لوقا ۱۳: ۳۱، ۳۲۔ مرقس ۲: ۶، ۱۶:

۱۸، ۲۴: ۳: ۶- ۳۰- ۷: ۱- ۱۳- ۸: ۱۱، ۱۵ وغیرہ) آپ کو دُور ہی سے موت اور صلیب نظر آرہی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سردار کاہن نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کرکے کہا" تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ مارا جائے ۔۔۔۔ اور وہ اُسی روز سے اُسے قتل کرنے کا مشورہ کرنے لگے" (یوحنا ۱۱باب) دریں حالات آپ نے باربار اپنے حوارئین سے کہا" ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہہ اُسے ردکریں۔ اور وہ قتل کیا جائے" اور سب سے کہا" اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور ہزار اپنی صلیب اٹھا کر میرے پیچھے ہولے کیونکہ جوکوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اُسے کھوئیگا۔ اور جوکوئی میرے خاطر اپنی جان کھوئے وہی اُسے بچائیگا آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کرلے اور اپنی جان کو کھودے یا اُس کا نقصان اٹھائے تو اُسے کیا فائدہ ہوگا" (لوقا ۹: ۲۲)۔

ان ارشادات میں حضرت کلمتہ اللہ نے ایک اٹل اخلاقی قانون اور روحانی حقیقت کا بیان کیا ہے کہ ہر شخص کو جو رضائے الہٰی کو پورا کرنا چاہتا ہے آفات ومصائب اور بلا آخر موت کا سامنا کرنے کےلئے تیار رہنا چاہیے (مرقس ۱۳: ۹ وغیرہ) جس طرح بیرونی کائنات اور نظامِ شمسی کے لاتبدیل قانون ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی اخلاقی دنیا کا ایک اٹل قانون ہے۔ اوراسی واسطے مقدس نوشتوں میں یہ بھی لکھا ہے اور منجئی عالمین اسی قانون کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں" جس طرح مقدس نوشتوں میں لکھا ہے" ابن آدم توجاتا ہی ہے" اس کا مسئلہ تقدیر سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ رضائے الہٰی کی پیروی کرے ۔ اس میں کوئی جبر واکراہ نہیں لیکن اگر وہ رضائے الہٰی کی پیروی کرنے کی فیصلہ کریگا تو اخلاقی دنیا کے قانون کے مطابق اس کا نتیجہ موت اور قتل ہوگا۔ اوراگر وہ شیطان کی پیروی کریگا تواسی اخلاقی دنیا کے اٹل قانون کے مطابق اسکا نتیجہ روحانی موت اورخدا سے دوری ہوگا۔ پس اخلاقی دنیا کے ان قوانین کے ماتحت خداوند نے فرمایا" ہم یروشلیم کو جاتے ہیں۔ ابنِ آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالہ کیا جائیگا۔ اور وہ اُس کے قتل کا حکم دیں گے۔ اوراُسے غیر قوموں کے حوالہ کرینگے۔ اور وہ اُسے ٹھٹھوں میں اڑائینگے

اوراُس پر تھوکیں گے۔ اُسے کوڑے مارینگے۔ اور قتل کرینگے"(مرقس ۱۰: ۳۳)آپ نے پھر دہرایا" وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا تھا" کہ ابن آدم آدمیوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ اوروہ اُس کو قتل کرینگے"(مرقس ۹: ۳۱)۔ اورپھر تاکید کرکے فرمایا" تمہارے کانوں میں یہ باتیں پڑی رہیں کیونکہ ابن آدم آدمیوں کے ہاتھ میں حوالہ کئے جانے کو ہے۔ لیکن وہ اس بات کو نہ سمجھتے تھے"(لوقا ۹: ۴۴) پر ابن اللہ چاہتے تھے کہ آپ کے رسول اس اخلاقی قانون اور روحانی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ جائیں کیونکہ اُن کو بھی انہی مزاحمتوں سے سابقہ پڑے والا تھا(متی ۲۴: ۸تا ۱۳وغیرہ)۔ لہذا اپنی ظفریاب قیامت کے بعد بھی آپ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا" اے نادانو۔ اورنبیوں کی سب باتوں کے ماننے میں سست اعتقادو کیا مسیح یہ دکھ اٹھا کر اپنے جلال میں داخل ہونا ضرور نہ تھا"؟(لوقا ۲۴: ۲۶)۔

آیہ شریفہ میں زیربحث ہے خداوند فرماتے ہیں کہ" ابن آدم توجاتا ہے ہی ہے"یہاں جیسا ہم اوپر ذکرکرچکے ہیں قسمت اورتقدیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب ہم ان الفاظ کا اصلی مطلب معلوم کرتے ہیں تو یہ بات اوربھی واضح ہوجاتی ہے۔ مقدس یوحنا انجیل چہارم میں ان الفاظ کا مطلب ہم کو بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھاتے ہیں(۷: ۳۳۔ ۸: ۱۴، ۲۱۔ ۱۳: ۳، ۳۳، ۳۶۔ ۱۴: ۴: ۴تا ۸۔ ۲۸۔ ۱۶: ۵، ۱۰، ۱۶تا ۲۲وغیرہ)۔ ان آیات بینات کی روشنی میں ہم کو پتہ چلتا ہے کہ ابن اللہ کو اپنے" جانے" کا غم یا افسوس نہ تھا۔ آپ نے فرمایا" میں بھیڑوں کےلئے اپنی جان دیتا ہوں۔ باپ مجھ سے اس لئے محبت رکھتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں۔ کوئی اُسے مجھ سے نہیں چھینتا بلکہ میں اُسے آپ ہی دیتا ہوں مجھے اُس کے دینے کا بھی اختیار ہے اوراُسے پھر لینے کا بھی اختیار ہے"(یوحنا ۱۰: ۱۵تا ۱۸)۔ پس یہاں تقدیر اورمجبوری کےلئے کوئی جگہ نہیں۔ بلکہ منجئی عالمین فاعلِ خود مختار ہونے کی حیثیت سے برضادرغبتِ خود موت کے پیالہ کو پیتے ہیں(یوحنا ۱۸: ۱۱)بلکہ آپ فرماتے ہیں کہ آپ نہایت ذوق وشوق سے موت کے منتظر ہیں" مجھے ایک بپتسمہ لینا ہے اورجب تک وہ نہ ہولے میں کیا ہی تنگ رہونگا"(لوقا ۱۲: ۵۰۔

متی ۲۰: ۲۸۔ فلپیوں ۲: ۸ وغیرہ)۔ " میں اسی مقصد کے لئے آیاہوں کہ اپنی جان بہتیروں کی بدلے فدیہ میں دوں"۔

(۳۔)

یہ ظاہرہے کہ اخلاقی دنیا کے قانون اور مذکورہ بالا روحانی حقیقت کے مطابق ابنِ اللہ کی تبلیغی مساعی اورزندگی کا انجام صلیب اورموت تھی توان اسباب کو فراہم کرنے کے لئے کسی نہ کسی وسیلہ کا ہونا بھی لازمی امر تھا۔ یہ وسائل کیا تھے؟ یہ وہی دوسری قسم کے کجرو، بدکردار انسان تھے جو اپنی ہوا وہوس اورخود غرضانہ اُمورکو پورا کرنے کی خاطر نیکی کی طاقت سے ٹکر لیتے ہیں وہ اہلِ یہود کے بزرگ، فریسی اورفقیہ تھے۔ اُن کے کاہن اورسردارکاہن بھی اُن کے ساتھ شامل تھے گورنر پلاطوس بھی اُن کا شریک تھا یہودی عوام بھی اس جماعت میں شامل تھے جوگورنر کے سامنے چلا چلا کر کہتے تھے"اسے صلیب دے صلیب دے ۔ اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد کی گردن پرہو" اس تمام جماعت کاآلہ کاریہوداہ غدار تھا(مرقس ۱۴، ۱۵ باب)لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر سیدنا مسیح کو روحانی دنیا کے قانون کے مطابق شہید ہونا ہی تھا توکسی نہ کسی شخص کو آلہ کار ضرور ہونا تھا۔ اگریہوداہ اسکریوتی نہ ہوتا تو وہ کسی اورآلہ کارکی تلاش کرلیتے۔ یہ محض سوئے اتفاق تھا۔ کہ یہوداہ نے جوآپ کے بارہ حواریوں میں سے تھا اس فعل بدکو اپنے ذمہ لے لیا۔ یہ اس کی قسمت میں نہیں لکھا تھا کہ وہ آپ کو پکڑوائیگا اورنہ یہ بات ابنِ اللہ کی تقدیر میں لکھی تھی کہ آپ اپنے ایک حواری کے ہاتھوں پکڑوائے جائینگے۔ بلکہ حالات ہی ایسے پیداہوگئے تھے کہ یہوادہ آپ کا پکڑوانے والا بنا۔ آپ یہوداہ پر افسوس کرکے فرماتے ہیں" میرا پکڑوانے والا میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالے ہے۔ اس شخص پر افسوس ہے کیونکہ اس کے وسیلہ ابن آدم پکڑوایا جارہاہے" اگرآپ کو افسوس تھا کہ تواپنے حواری کی بے وفائی پر جس نے آپ کی محبت اورگذشتہ خدمت کو پیٹھ پیچھے پھینک کر فراموش کردیا تھا اوراب منافقانہ رویہ اختیار کرکے آپ کے ساتھ ایک ہی طباق میں کھانا کھارہا تھا اور مشرقی وضعداری کو بھی بالائے طاق رکھ کر غداری کے خیالات کو اپنے دل میں پال رہا تھا ۔ سیدنا مسیح فرماتے ہیں" اگر وہ پیدا نہ ہوتا تواُس کیلئے اچھا ہوتا" کیونکہ اُس نے

نیکی اوربدی کی جنگ میں نیکی کا ساتھ چھوڑکربدی کو برضاد رغبت خوداختیار کرکے اپنے لئے روحانی موت حاصل کرلی۔ سیدنا مسیح اس سے آخر تک محبت کرتے ہیں (یوحنا ۱۳: ۱) اورمحبت کے مارے اس کو ایک آخری موقعہ دیتے ہیں کہ وہ سنبھل جائے۔ واجب تویہ تھا کہ یہوداہ سیدنا مسیح کے اس قول سے متنبہ ہوکر پچھتاتا اورتوبہ کرکے اپنے بد ارادہ سے باز رہتا۔ سیدنا مسیح کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے رسالت کے عہدہ کو جس پرآپ نے اُس کو ممتاز کیا تھا یادرکھ کر بدی کی طاقتوں کا آلہ کارنہ بنے۔لیکن اُس نے جان بوجھ کر فاعلِ خود مختارہونے کی حیثیت سے ایسا نہ کیا۔ جائے غورہے کہ دیگر انسانوں کی طرح منجئی عالمین اس کو بددعا نہیں دیتے۔ نہ آپ اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ نہ آپ پطرس جیسے جلد باز شخص کو اُسے پکڑلینے کا حکم دیتے ہیں بلکہ اس کے انجام پر اظہارِ تاسف کرکے فرماتے ہیں " اگر وہ پیدا نہ ہوتا تواُس کےلئے اچھا ہوتا"۔ زندگی خدکا کا عطیہ ہے لیکن یہودا اس عطیہ کو خدا کے جلال اوردنیا کے بہتر بنانے کی خاطر استعمال کرنے کی بجائے دنیا کو تاریک بنانے اورظلمت کی طاقتوں کی مدد کرنے کے لئے استعمال کررہا تھا۔ اُس نے پیدائش کی برکت کو زندگی کی لعنت میں برضادرغبتِ خود بغیر کسی طرح کے جبر کے تبدیل کردیا۔ اُس کی روحانی حالت لرزہ براندام کردینے والی اوراُس کا انجام نہایت ہولناک تھا۔ اُس کےلئے یہ بہتر ہوتاکہ وہ پیدا نہ ہوتا اورایسے بھاری گناہ کا بوجھ اُس کی روح پر نہ پڑتا۔ آپ نے اُس کو پہلے بھی تنبیہ دے کر فرمایا تھاکہ" ٹھوکروں کے سبب دنیا پر افسوس ہے کیونکہ ٹھوکروں کا لگنا ضرور ہے لیکن اُس آدمی پر افسوس ہے جس کے باعث سے ٹھوکرلگے"(متی ۱۸: ۷)۔

(۴۔)

ہم اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کردیتے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوئی ہے۔ مہاتما گاندھی ان چید چیدہ افراد میں سے تھے جنہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق بدی کی طاقتوں کے ساتھ سر دھڑکی بازی لگادی تھی۔ جہاں تک ممکن تھا آپ نےاپنی سمجھ کے موافق اپنے اصولوں پر بے دھڑک چلنے کی کوشش کی اورانجام کی پرواہ نہ کی۔ بسا اوقات آپ کی ٹکر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے

ساتھ ہوئی ۔ آپ نے ستیاہ گرہ اور اہنسا کے ہتھیاروں سے بدی کی طاقتوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔ اس سلسلہ میں آپ پر مقدمات چلائے گئے ۔ آپ کو زندان میں ڈالا گیا۔ آپ نے فاقے کئے ۔ مرن برت رکھے ۔ دریں حالات بیسیوں دفعہ لوگوں کی زبان سے بے اختیاریہ کلمہ نکل جاتا تھا کہ مہاتما جی دے دینگے۔ بلاآخر آپ قتل بھی کردئیے گئے لیکن کوئی صیح العقل شخص یہ نہیں کہیگا کہ قتل ہوجانا ان کی قسمت میں لکھا تھا اورکہ قاتل کی تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ وہ گاندھی جی جیسے مہا پرُش کو جو صدیوں کے بعد جاکر کہیں پیدا ہوتا ہے قتل کردے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی دنیا کے اٹل قانون کے مطابق زندگی کی جوروش مہاتماجی نے اختیارکرلی تھی اُس کا لازمی نتیجہ موت تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ نہ وہ زندان میں فوت ہوئے اورنہ مرن برت کے وقت اُنہوں نے اپنی جان دی بلکہ اُن کے اپنے لوگوں میں سے ایک ایک آپ کو قتل کردیا۔ اگر اُس کے ہاتھوں آپ کی موت واقع نہ ہوتی توکسی دوسری طرح واقع ہوجاتی۔کوئی دوسرا شخص بدی کی طاقتوں کا آلہ کار ہوجاتا ۔ لیکن قاتل کے حق میں دنیایہی کہتی ہے کہ اُس آدمی پر افسوس جس کے ہاتھوں مہاتماجی قتل ہوگئے۔اگر وہ آدمی پیدا نہ ہوتا تواُس کے لئے اچھا ہوتا۔

یہ مثال ہم نے اس واسطے دی ہے کیونکہ یہ تازہ واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے اور اخلاقی دنیا کے اُس لاتبدیل قانون کو سمجھنے میں ہماری مدد کرسکتا ہے جس کا ذکرہم اوپرکرآئے ہیں۔لیکن اس مثال سے کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم مہاتماجی کے قتل کو اور منجئی عالمی کے مصلوب ہونے کو یکساں درجہ دیتے ہیں۔ ابن اللہ نے دیگر نیک انسان کی طرح نہ صرف اپنی زندگی اور موت سے راستبازی کی بادشاہت کے قوانین پر عمل کرکے یسعیاہ نبی کے " خداوند کے خادم" کے مطمع نظر کوکامل طورپر ثابت کر دکھلایا بلکہ آپ کی راستبازی اُس کامل ایثاراورازلی محبت کی قربانی کا ایک ایسا نمونہ تھی جو بے عدیل اور بے نظیر ہے جس کو دیکھ کر شقی القلب آدمیوں کی شقاوت سعادت سے بدل جاتی ہے اوروہ اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرکے ازسر نو پیدا ہوکر خدا کے فرزند بن جاتے ہیں۔آپ کی راستبازی نے بدی کو طاقتوں پر ایسا غلبہ پالیا کہ " موت فتح کا لقمہ ہوگئی"

پر ہر نجات یافتہ ایماندار پکار اٹھتا ہے" اے موت تیرا ڈنک کہاں رہا؟خدا کا شکر ہے جو ہمارے آقا ومولا سیدنا مسیح کے وسیلے ہم کو فتح بخشتا ہے۔ اورہم کو سب حالتوں میں فتح سے بھی بڑھ کرغلبہ حاصل ہوتا ہے"۔

"وہ تیسرے روزمرُدوں میں سے جی اٹھا"

زندہ فاتح مسیح

مبارک جمعہ کے روز یہودی سردار کاہنوں نے جو کلمتہ اللہ کے خون کے پیاسے تھے۔اپنے ناجائز اثر ورسوخ سے رومی گورنر کے ہاتھوں آپ کو مصلوب کروادیا۔ وہ اپنے زعمِ باطل میں یہی سمجھے تھے۔ کہ جوکانٹا اُن کی راہ میں مدت سے کھٹک رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کےلئے نکل گیا ہے۔فریسی اپنی جگہ خوش تھے کہ اب" گنہگاروں کا یار" عوام الناس کو خدا کی لازوال مغفرت اورابدی محبت کا پیغام سنا سنا کراُن کو بہکانہ سکیگا۔ فقیہہ ٹھٹھے سے کہتے تھے" اُس نے اوروں کو بچایا۔ لیکن اپنے آپ کو نہ بچاسکا"۔ ذیلوتیس سمجھتے تھے کہ اب یہودی قوم کی قسمت پھر جاگ اٹھے گی۔ اوروہ رومی قیاصرہ کے خلاف علمِ بغاوت دوبارہ بلند کرسکینگے۔کیونکہ وہ شخص جو محبت کے اُصول کا واعظ اوراس پر آخری لمحہ تک کاربند رہا تھاآغوشِ لحد میں سوگیا ہے۔ رسول بیکس ولا چار، خائف وہراساں ہوکر نا اُمیدی اوریاس کی حالت میں ادھر اُدھر بھاگے پھررہے تھے۔ وہ وفورِعم سے بصد حسرت کہتے "

یسوع ناصری مصلوب کیا گیا۔ لیکن ہم کو اُمید تھی کہ وہی اسرائیل کو مخلصی دیگا" (لوقا ۲۴: ۲۰)۔

یہ سب باتیں جمعہ کے روز ہوئیں۔ لیکن دودن کے بعد اتوار کے روز ابنِ اللہ کی ظفریاب قیامت نے اہلِ یہود کے تمام حلقوں میں قیامتِ صغریٰ برپا کردی۔ ہر طبقہ میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اُس روز یروشلیم کی دنیا کا نقشہ بدل گیا وہ جو پہلے خوش وخرم پھرتے تھے اب دوبارہ پھر ہراساں نظر آنے لگے۔ وہ جو پہلے بھاگے پھرتے تھے۔ اب اُن کے چہروں پر فرطِ انبساط سے فتح مندی کے آثار ہر شخص کو نظر آنے لگے۔ صاحبِ اقتدار اور بارسوخ روسائے قوم نے ہر ممکن طور پر اُن فتحمند بھگوڑوں کو دبانے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی ۔ سوشل بائیکاٹ ، زجروتوبیخ ، قیداورایذا ، تلوار اور موت غرضیکہ ہر ممکن حربہ اُنکے خلاف استعمال کیا گیا۔ لیکن سب بے سود، وہ جو اپنی کمزوری کی وجہ سے "تھالی کی بینگن " اور" لوٹا" بنے ہوئے تھے اورمعمولی لونڈی کے ایک ہی سوال سے ترساں و لرزاں تھے۔ اب شیر دل ہوگئے۔ اورسردار کاہنوں کو (جن کے ہاتھ میں اُن کی زندگی اورموت تھی) برملا ملامت کرکے کہتے تھے" تم نے زندگی کے مالک کو مروادیا تھا۔ تم ہی انصاف کرو۔ آیا خدا کے نزدیک یہ واجب ہے کہ ہم خدا کی بات سے تمہاری بات زیادہ سنیں کیونکہ ممکن نہیں کہ جو ہم نے دیکھا اورسنا ہے وہ نہ کہیں" (اعمال ۴باب)۔

اس زبردست تبدیلی کی کیا وجہ تھی؟ اُن کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا۔ کہ اُن کا خداوند مردوں میں سے جی اٹھا ہے۔ ایسی بات تو پہلے نہ کبھی دیکھی اورنہ سنی گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ شروع میں" یہ باتیں اُنہیں کہانی سی معلوم ہوئیں اور اُنہوں نے اُن کا یقین نہ کیا" (لوقا ۲۴: ۱۹) لیکن جب اُنہوں نے زندگی کے مالک زندہ مسیح کو " اپنے کانوں سے سنا اوراپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے چھوا" (۱یوحنا ۱: ۱) جب وہ بارہ کو دکھائی دیا۔ پھر پانچ سو سے زیادہ بھائیوں کو ایک ساتھ دکھائی دیا۔ پھر یعقوب کو دکھائی دیا۔ پھر سارے رسولوں کو" (۱کرنتھیوں ۱۵: ۱۵) جب اُس نے اُن سے کہا" اے نادانو اور نبیوں کی ساری باتیں ماننے میں سست اعتقاد و۔کیا مسیح کویہ دکھ اٹھا کر اپنے جلال میں داخل ہونا ضرورنہ تھا"؟تب اُن کی آنکھیں کھلیں۔اُن کے دلِ

جوش سے بھر گئے۔ اوروہ بے اختیار ایک دوسرے کو یہ خوشی کی خبر دیتے تھے"۔ خداوند بے شک جی اٹھا ہے"(لوقا ۲۴باب) " فی الواقع مُردوں میں سے جی اٹھا ہے"۔ (۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۰)۔ یہ بات عین الیقین کی حد تک ثابت ہوچکی تھی۔ اور وہ سروفروشانہ اس حقیقت کی خاطر جو اُن کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ مرنے اور موت کے گھاٹ اُترنے کو تیار تھے۔ مسیحیت کا طغرائے امتیاز یہی قیامت مسیح کا عقیدہ تھا"اگر مسیح جی نہیں اٹھا ۔ تو تمہارا ایمان بے فائدہ"(۱کرنتھیوں ۱۵: ۱۷)۔ اگر وہ زندہ نہیں ہوا اور دیگر انبیاء کی طرح زیر زمین دفن ہے تو حضرت خلیل اللہ ، موسیٰ کلیم اللہ جیسے انبیاء اللہ میں اورابن اللہ میں کوئی حقیقی فرق نہ رہا۔ وہ محض نبیوں کی قطار میں ہی شمار کیا جاسکتا ہے۔ بڑی سے بڑی بات جو اُس کے حق میں کہی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ ایک اوالعزم اورجلیل القدر نبی تھا اوربس۔ لیکن اگر وہ مُردوں میں سے جی اٹھا ہے تو وہ موت پر غالب آیا ہے اورسب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا ہے کہ ابن اللہ میں اور دیگر انبیائیں بعد المشرقین ہے۔ پس وہ نبیوں کی صف میں کھڑا نہیں کیا جاسکتا دیگر انبیاء کا تعلق زمانہ ماضی سے تھا۔۔ اس کا تعلق دورِ حاضرہ اور مستقبل سے ہے۔ دیگر انبیاء محض تواریخی اشخاص تھے جو صفحہ ہستی پر آکر اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ لیکن ابن اللہ نے خود تاریخ کو دوحصوں میں منقسم کردیا۔ ایک زمانہ قبل ازمسیح اوردوسرا زمانہ بعد مسیح دوسرے زمانہ کا تعلق دورِ حاضرہ اور زمانہ مستقبل سے ہے۔ یہ زمانہ قیامت تک جاری رہیگا۔ کیونکہ مسیح اب بھی زندہ ہے اور ابدآلاباد زندہ رہے گا۔

اس نکتہ کو مرزائے قادیانی خوب سمجھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس غریب نے عمر گرانمایہ اسی بے سود کوشش میں ضائع کردی کہ مسیح مردوں میں سے نہیں جی اٹھا اور وہ دوسرے نبیوں کی مانند مرگیا ہے۔ اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن دم واپسین حسرت کے ساتھ اپنی زندگی کا مشن پورا کئے بغیر ناکام اورنامراد چل بسا اورخود قبر میں ہمیشہ کے لئے سوگیا۔ اُس کی ناکام مساعی ہر جگہ زبان حال سے پکار پکارکر ابن اللہ کی ظفریاب قیامت کی گواہ ہیں اوراس حقیقت کو عالم وعالمیان پر روشن کردیتی ہیں کہ مسیح فی الواقعہ

مُردوں میں سے جی اٹھا ہے اورمُردوں میں سے جی اٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا"۔

سیدنا مسیح کی ظفریاب قیامت کے ثبوت

منجئی عالمین کی ظفریاب قیامت مسیحیت کی عمارت کے کونے کا پتھر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقدس پولوس رسول فرماتے ہیں کہ:

اگرمسیح نہیں جی اٹھا توتمہارا ایمان بے فائدہ ہے۔ تم اب تک اپنے گناہوں میں گرفتار ہو۔ اگر ہم صرف اسی زندگی میں مسیح میں اُمید رکھتے ہیں تو سب آدمیوں سےزیادہ بدنصیب ہیں" (۱کرنتھیوں ۱۵: ۱۷تا ۱۸)۔

اگرآنخداوند مُردوں میں سے نہیں جی اٹھے توآپ میں اور باقی انبیاء میں سوائے آپ کی معصومیت کے کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسی سبب سے کلیسیا ابتدا ہی سے اس واقعہ پر زور دیتی چلی آئی ہے اورنجات کا تمام دارومدار منجئی کی ظفریاب قیامت پر رکھ کر یہ خوشی کی خبر دیتی ہے کہ آنخداوند نے گناہ، شیطان، موت اورقبر پر فتح پائی ہے۔ پس وہ ہم گنہگاروں کو گناہ کی بدترین قید سے نجات دینے پر قادر ہے۔

مخالفینِ مسیحیت بھی اس نکتہ کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرزائے قادیانی اپنے مقلدین کو مرتے دم یہی وصیت کرگئے کہ مسیحیت کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ یہ ثابت کردیں کہ موت نے دیگر انبیاء کی طرح جنابِ مسیح کو بھی نگل لیا ہے۔ پس وہ سرینگر کے محلہ خان یار کی قبر کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور احمقوں کو دام تزذیر میں پھنساتے ہیں۔

(۲۔)

انجیل جلیل کے مجموعہ کی ہر کتاب اوراس کا ہر مصنف اس ایک بات پر متفق ہے کہ منجئی عالمین مبارک جمعہ کے روز مصلوب کئے گئے اورمدفون ہوئے اوراتوار کے روزعلیٰ الصبح مُردوں میں سے جی اٹھے مسیحیت کی ابتدائی منزل اس کے آقا اورمولا کی ظفریاب قیامت کا واقعہ ہے اوراعمال کی کتاب صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ واقعہ دوازدہ

رسولوں کی ابتدائی منادی کا مرکز تھا اوروہ اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے (۱کرنتھیوں ۱۵: ۳)۔

(۔۳)

سائنس اور فلسفہ کا یہ ایک ادنیٰ اصول ہے کہ ہر واقعہ کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے جس کو اعمال کے ابتدائی ابواب کا مطالعہ واضح کردیتا ہے کہ منجئی عالمین کی صلیبی موت کے بعد سیدنا مسیح کے رسولوں کی ذہنیت ،اُن کے رنگ ڈھنگ ، اورنظریہ زندگی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ جو پہلے خوف کے مارے کواڑ بند کرکے چھپتے پھرتے تھے ۔ (یوحنا ۲۰: ۱۹) اب علانیہ منادی کرتے اوربیدھڑک ہوکر سب کے سامنے آتے ہیں (اعمال ۴: ۱) پہلے یہودی بزرگوں اور سردار کاہن کے خیال ہی سے اُن کے بدنوں پر رعشہ طاری ہوجاتا تھا لیکن اب وہی قائدن قوم اورسردارکاہن ان دہقانوں سے خائف وترساں ہیں(اعمال ۴: ۱۳۔ ۲۰، ۵: ۲۵۔ ۳۰ وغیرہ) لازم ہے کہ اس قدر حیرت انگیز تبدیلی کا کوئی زبردست سبب بھی ہو۔ منجئی عالمین کی صلیبی موت کے بعد آپ کی ظفریاب قیامت کے عظیم الشان واقعہ کے علاوہ کوئی اورواقعہ رونما نہیں ہوا تھا جو خاطر خواہ طورپر اس زبردست نتیجہ کا حامل ہوسکے۔ جو لوگ قیامتِ مسیح کے واقعہ کے منکر ہیں اُن پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ رسولوں کی ذہنیت کی عظیم تبدیلی کا سبب بتلائیں ورنہ ایمان داری کو کام میں لاکر منجئی عالمین کی قیامت کے واقعہ کا اقبال کرلیں۔

(۔۴)

منجئی عالمین کوکسی غیر معروف اوردور افتادہ مقام میں صلیب نہیں دی گئی تھی۔ ارضِ مقدس کے یہود مبارک جمعہ کے دن یروشلیم کے مقدس شہر میں عید منانے کیلئے جمع تھے اورگورنر پلاطوس نے سردا رکاہن کے ایما اوریہودی ہجوم کے ہلڑ مچانے پر آپ کو دیگر مجرموں کے ساتھ علانیہ مصلوب کرایا تھا۔ پس تمام اہل یہود، کیا روساء اورکیا عوام سب کے سب آپ کی صلیبی موت سے واقف تھے اورسب پر یہ امر روشن ہوچکا تھاکہ آپ صلیب پر مرگئے تھے۔ اب انہی یہودی روساء عمائدینِ قوم اورعوام کے سامنے دوزادہ رسول باربارگواہی دیتے ہیں منجئی جہاں مرُدوں میں

سے جی اٹھے ہیں(اعمال ۳: ۱۳تا ۱۵ وغیرہ) اوران کی منادی کا نتیجہ یہ ہوتاہے کہ یہی یہود جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ کومرتے دیکھا تھا مزاروں کی تعداد میں آپ کی ظفریاب قیامت پر ایمان لے آتے ہیں (اعمال ۲: ۴۱، ۴: ۲، ۶: ۷ وغیرہ)اگرسیدنا مسیح فی الواقع مُردوں میں سے نہیں جی اٹھے تھے تواُن لوگوں نے (جوآپ کی موت کے چشم دید گواہ تھے) ہزاروں کی تعداد میں یہ خلافِ عقل بات کس طرح مان لی؟اور وہ بھی ایسے ناموافق حالات میں جو حوصلہ شکن اورکمر توڑ تھے کیونکہ سردارکاہن اورقائدین یہود ایذا دینے اورمخالفت کرنے پر تلے ہوئے تھے(اعمال۴: ۲۹، ۵: ۳۳، ۶: ۱۲، ۸: ۱وغیرہ)۔

(۵۔)

جب یروشلیم کی مسیحی کلیسیا کو اہلِ یہود کی متواتر مخالفت اورپے درپے کی ایذا رسانیوں نے پراگندہ کردیا تو سیدنا مسیح کے رسول اوردیگر ایمان دارارضِ مقدس کے دیگر مقامات کی جانب حکمِ خداوندی کے مطابق ہجرت کرگئے اوربعض شام،آسیہ،آخیہ ، اورممالك یورپ کی جانب بڑھے۔ لیکن جہاں بھی وہ گئے وہ منجئی عالمین کی ظفریاب قیامت کی خوشخبری کااعلان کرتے گئے ۔ تاریخ اس امر پرگواہ ہے کہ پہلی صدی میں ہر ملك اورہر مقام کے یہود غیر مسیحی جن میں لاکھوں لکھے پڑھے اورہزاروں عالم تھے اس بات پر صدقِ دل سے ایمان رکھتے تھے اورہر مقامی کلیسیا کے وردِ زبان یہی عقیدہ تھا کہ" مسیح پنطوس پلاطوس کی حکومت میں مصلوب ہوا۔ مرگیا ، دفن ہوا اورتیسرے روز مردوں میں سے جی اٹھا "۔ یہی عقیدہ دوہزارسال سے کلیسیا کے وردِ زبان رہاہے اورآج بھی ہر ملك قوم اورنسل کی کلیسیا کا یہی عقیدہ ہے۔

(۶۔)

اعمال کی کتاب کا مطالعہ اس امر کو روشن کردیتا ہے کہ رسولوں کی منادی کا مرکز قیامتِ مسیح کا واقعہ اوراس کے حقیقی معانی کوظاہر کرنا تھا۔ (۲: ۳۶، ۱۰: ۴۰۔ ۴۲ وغیرہ)۔ مقابلہ کرو (رومیوں ۱: ۴) رسولوں کے مکتوبات ثابت کرتے ہیں کہ اس واقعہ کے مطالب ومعانی خدا کی ذات وصفات کے سمجھنے میں نہایت ممد اور معاون ثابت ہوئے۔(۱

تھسلنیکیوں۱: ۱۰۔ اعمال ۵: ۲۹۔ الخ، افسیوں ۱: ۱۹۔ ۱پطرس ۱: ۲۱ وغیرہ)اسی ایک واقعہ کی روشنی میں رسول نہ صرف خدا کی ذات وصفات کے تصور کو واضح کرتے تھے بلکہ دیگر مسائل کو بھی سمجھاتے تھے ۔ مثلاً روح القدس کا مسئلہ (رومیوں ۸: ۱۰، ۱۱) کفارہ کا مسئلہ (رومیوں ۴: ۲۵) اخلاقی روحانی زندگی کا مسئلہ (۲کرنتھیوں۵: ۱۵، افسیوں۲: ۵۔ کلسیوں ۲: ۱۳۔ ۱کرنتھیوں ۱۵: ۱۷) فنا اور بقا کا مسئلہ (۱کرنتھیوں ۱۵باب، ۲تمطاؤس ۱: ۱۰)۔ وغیرہ وغیرہ غرضیکہ اس ایک واقعہ نے انسانی زندگی پر نئے سرے سے روشنی ڈال کر اس کے مختلف پہلوؤں کے مطلب ، مفہوم اورمقصد کو کلیتہً بدل دیا اوراب حقیقی مسیحی زندگی کا مطلب ہی یہ سمجھاگیا کہ وہ صرف موت ہی سے نکلتے ہیں۔

اگر قیامتِ مسیح ایک امر واقعہ نہ تھا تویہ تمام اُمور ایک زبردست معمے کا لامتناہی سلسلہ بن جاتے ہیں ۔ جن کا کوئی دوسرا حل سجھائی نہیں دیتا۔ اگربارہ رسول قیامتِ مسیح کے ماننے اوراُس کا پرچارکرنے میں محض ایک ذہنی دھوکا ، سراب، وہم اورمغالطے کا شکارتھے تو سوال یہ پیداہوتا ہے کہ کیا محض وہم اوروسوسہ میں اس قدرطاقت، قوت اورزندگی ہوسکتی ہے کہ خدا اور مذہب کے بنیادی تصورات ایک معقول نظام میں مربوط ہوکر دنیا کی کایا پلٹ دیں؟ ہرشخص جس کے سر میں دماغ اوردماغ میں عقل ہے اس قسم کے مضحکہ خیزنظریہ کو رد کرنے میں ذرابھی تامل نہ کریگا۔

پس ثابت ہواکہ اس قدرعظیم الشان تبدیلی کا صرف ایک ہی واحد اور مکتفی سبب ہوسکتاہے اور وہ قیامتِ مسیح کا عظیم واقعہ ہے۔

السلام علیکم

(تمہاری سلامتی ہو)

مرحوم ثناء اللہ صاحب نے اس نام کا ایک ۱۶صفحہ رسالہ لکھا تھا"جس میں اسلامی سلام کے احکام اور دیگر مذاہب کے سلاموں سے مقابلہ کیا گیا ہے"آپ فرماتے ہیں کہ سلام کرنے کا اسلامی حکم" السلام وعلیکم" ہے۔ آپ قرآن کو کامل اوراکمل کتاب ماننے کے باوجود کوئی قرآنی آیت پیش نہیں کرتے جس میں اس" اسلامی سلام کے احکام" درج ہوں۔ اورصرف چند احادیث کی جانب رجوع کرتے ہیں اوریہ رونا روتے ہیں کہ مسلمانوں میں "السلام علیکم" کہنا ہی بے ادبی اورخلافِ تہذیب سمجھا گیا ہے بجائے اس کے ہاتھ کھڑا کرنا اورآداب عرض کہنا تواکثر گاہے تسلیمات عرض ہورہا ہے اورساتھ ہی اس کے جھکنے میں اس قدرافراط ہے کہ قریب قریب رکوع کے ہوجاتا ہے "(صفحہ ۱) اورآپ کا فتویٰ یہ ہے کہ"یہ مذہبی طریق نہیں"(صفحہ۹)

رسالہ کے باب دوم میں آپ فرماتے ہیں" عیسائیوں میں مختلف طریق پائے جاتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ملتے وقت ٹوپی اتارلیتے ہیں اور زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ یہ رواج اکثر انگریزوں میں ہے۔ ہاتھ اٹھاکر اشارہ کرتے ہیں اورتکمیل اس کی مصافحہ سے ہوتی ہے"تیسرا طریق یہ ہے کہ (گوڈمارننگ) کہتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ" صبح اچھی ہے ۔ جس سے غالباً ایک تفاول ہوتا ہے کہ زمانہ موافق رہے۔ عجب نہیں کہ یہی طریق عیسائیوں کا مذہبی ہو"(صفحہ ۲)۔

مولوی صاحب یہ دعویٰ کرتے کبھی نہیں تھکے کہ آپ کو مسیحی کتب مقدسہ کی کامل واقفیت حاصل ہے۔ (اسلام اورمسیحیت ۳۸ وغیرہ)۔ لیکن آپ کی علمی بے بضاعتی اور انجیل دانی کی بے سروسامانی کا یہ حال ہے کہ آپ نے انجیل جلیل کھول کر یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کہ سیدنا مسیح نے اس بارے میں کیاحکم دیاہے اور خود حضرت کلمتہ اللہ کا کیا طریقہ کار تھا۔ اورآنخداوند کے رسولوں کا کیا رویہ تھا۔ آپ کے مندرجہ بالا الفاظ سے آپ کے ناظرین تو غالباً یہی سمجھیں گے کہ حضرت کلمتہ اللہ ملتے وقت ٹوپی

اُتارتے اور زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے"۔ یا حضور"ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے اور مصافحہ کرتے تھے" اور یا "گوڈمارننگ" کہتے تھے کیونکہ بزعم جناب "یہی طریق عیسائیوں کا مذہبی" طریق ہے۔

بچارے مولوی فاضل صاحب کو کیا پتہ کہ" سلام علیکم" خالص عبرانی زبان کے الفاظ ہیں اورسیدنا مسیح سے صدیوں پیشتربنی اسرائیل میں ملاقات کے وقت اوررخصت کے موقعہ پر استعمال کئے جاتے تھے۔ مثال کے طورپر حضرت یوسف نے مصر میں اپنے بھائیوں سے ملاقات کرتے وقت یہی الفاظ استعمال کئے تھے (پیدائش ۴۳: ۲۳) اہل یہود کے انبیاء بادشاہ اورعوام الناس یہی مذہبی طریق استعمال کرتے تھے(۱سیموئیل ۱: ۱۷۔ ۲سیموئیل ۱۵: ۱۔ زبور۱۲۲آیت ۷ الخ وغیرہ) خدا نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ حکم دیا تھاکہ حضرت ہارون اورکاہن بنی اسرائیل کو اسی طرح برکت دیا کریں۔ (گنتی ۶: ۲۶الخ)۔

انجیل جلیل سے پتہ چلتاہے کہ جب منجئ عالمین کسی سے ملاقات کرتے تھے تویہی کلمہ آپ کی زبان مبارک پر ہوتا تھا ۔ (یوحنا ۲۰: ۱۹، ۲۲۔ لوقا ۲۴: ۳۶) جب آپ رخصت ہوتے توآپ یہی الفاظ دہراتے تھے(یوحنا ۲۰: ۲۱) جب ابنِ اللہ کسی کو برکت دیتے تویہی الفاظ فرماتے تھے(مرقس ۵: ۳۴۔ لوقا ۷: ۵۰، ۸: ۴۸ ۔ یوحنا ۱۴: ۲۷ وغیرہ)۔جب آپ کی زبانِ معجزبیان سے یہ کلمہ نکلتا تواس کی وجہ سے کسی رسمی" مذہبی طریق" کی پابندی نہ تھی۔ اس کلمہ کے الفاظ کسی رواجی ظاہر داری کے نشان نہیں ہوتے تھے (یوحنا ۱۴: ۲۷) بلکہ یہ کلمہ لوگوں کیلئے اس بات کی گارنٹی تھا کہ خدا تعالیٰ کے مسیح موعود کی برکت اور سلامتی اُن کے شاملِ حال ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ ایمان تھاکہ مسیح موعود کا عہد سلامتی کا عہد ہوگا"(یسعیاہ ۵۴: ۱۰۔ حزقی ایل ۳۴: ۲۵، ۳۷: ۲۶۔ احبار۲۶: ۶ ملاکی ۲: ۵، ۶ وغیرہ) کیونکہ وہ خود سلامتی کا شہزادہ ہوگا(یسعیاہ ۹: ۶) مقابلہ کرومیکاہ ۵: ۵۔ زکریاہ ۶: ۱۳۔ زبور۷۲: ۳، ۷۔ زبور۲۹: ۱۱، ۱۲۶: ۷۔ یسعیاہ ۵۵: ۱۲ وغیرہ) اوراس کے وسیلے خدا اقوام عالم کو سلامتی بخشیگا (زکریاہ ۹: ۱۰وغیرہ) جب حضرت ابن اللہ نے رسولوں کو فرمایا" میں سلام تم لوگوں کیلئے چھوڑے جاتاہوں اپنی سلامتی میں تم کو

دیتاہوں"[1](یوحنا ۱۴: ۲۷) آپ نے اپنی ذات کے بنیادی اصول کو اُن پر ظاہر کردیا۔ کیونکہ یہ سلامتی اُس قربت رفاقت اوریگانگت کا نتیجہ تھی۔ جو خیال قول اورفعل میں ابن اللہ کو باپ کے ساتھ حاصل تھی(یسعیاہ ۳۶: ۳۔ یوحنا ۱۴: ۱۱، ۲۰، ۳۱ وغیرہ) یہی وجہ تھی کہ پریشان اور مضطرب انسان ہزاروں کی تعداد میں جوق درجوق آتےاورآپ سے سلامتی۔ اطمینانِ قلب اورآرام جان حاصل کرتے تھے جو ان کواور کہیں نصیب نہ ہوتا تھا(متی ۱۱: ۲۸)۔

آنجہانی مولوی ثناء اللہ صاحب نے انجیل جلیل کے ورق پلٹنے کی تھی زحمت کبھی گوارا نہیں فرمائی۔ اگرآپ ذرا سی تکلیف اٹھالیتے توآپ پرظاہر ہوجاتا کہ مسیحیوں کا" مذہبی طریق" نہ " ٹوپی اٹھانا" ہے۔ نہ" مصاحفہ کرنا" ہے اور نہ" گوڈمارننگ" کہنا ہے۔ کیونکہ حضرت کلمتہ اللہ نے جماعت مومنین کو حکم دیا تھاکہ جب وہ کسی کے گھر میں داخل ہوں توگھر والوں کو" سلام علیکم" کہیں(متی ۱۰: ۱۲لوقا ۱۰: ۵ وغیرہ) اگرمولوی صاحب صرف مقدس پولوس رسول کے مختلف خطوط کی ابتدائی آیات پر ہی سطحی نظر ڈالتے توآپ کو معلوم ہوجاتا۔ کہ مکتوبات میں مخاطبوں کو سلام علیکم کہا گیا ہے(رومیوں ۱: ۷۔ ۱کرنتھیوں ۱: ۳۔ ۲کرنتھیوں ۱: ۲ گلتیوں ۱: ۳ وغیرہ) جوخط حضرت کلمتہ اللہ کے بھائی مقدس یعقوب نے بارہ فرقوں کو لکھا ہے وہ بھی سلام ہی شروع کیا گیا ہے(۱:۱)لیکن مولوی صاحب تحقیقِ حق کی طرف سے بے نیازہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی شان بے نیازی نے ان کو قرآنی ارشادات کی طرف سے بھی بےپرواہ کردیا ہے کیونکہ آپ قرآنی ارشاد کے عین خلاف مسیحیوں کو" کافر" شمارکرکے" ہندوؤں" کے ساتھ ایک ہی زمرہ میں شامل کرتے ہیں(صفحہ ۱۴) لیکن قرآن نے ایسے ایمان پر ختمہ اللہ علی قلوبھم کی مہرثبت کردی ہے۔

مولوی صاحب فرماتے ہیں" السلام وعلیکم کے معنی ہیں تم پر ہر طرح سے سلامتی اورآسائش ہمیشہ ہے" جس سے ان کی مراد جسمانی صحت اور دشمن سے سلامتی

[1]اسی سلامتی کی طرف قرآن شریف میں اشارہ ہے جب کلمتہ اللہ گھوارہ میں فرماتے ہیں واسلامہ علی ولدت ویوم اُموت ویوم ابعت حیاً(ترجمہ)سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوااورجس روزمرونگا اورجس روززندہ اٹھا کھڑا کیا جاؤنگا"(سورہ مریم آیت ۲۲)

ہے(صفحہ ۱۱) لیکن انجیل جلیل کے مطابق" سلام علیکم" سے مراد نہ صرف جسمانی صحت اور دنیاوی سلامتی ہے بلکہ روحانی سلامتی۔ اطمینان اورشانتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ خدا کو " سلامتی کا خدا" کہا گیا ہے(رومیوں ۱۵: ۳۳، ۲کرنتھیوں ۱۳: ۱۱۔فلپیوں ۴: ۹ ، عبرانیوں ۱۳: ۲۰ وغیرہ) اور انجیل شریف میں نہ صرف خدا کی سلامتی کا بھی ذکر ہے بلکہ سیدنامسیح کی سلامتی کا بھی ذکر ہے۔ (رومیوں ۱: ۷) سلامتی ہر مسیحی کی موجودہ ملکیت اور مقبوضہ شے ہے(یوحنا ۱۴: ۲۷۔ رومیوں ۱۵: ۱۳۔ ۲تھسلنیکیوں۳: ۱۶ وغیرہ)۔ جوہمارے دلوں پر حکومت کرتی ہے(کلسیوں ۳: ۱۵) یہ قلب کی اُس کیفیت کا نام ہے جس میں نہ اضطراب ہے اورنہ تموج ۔ وہ روح کی طمانیت اورسکون پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس کو حتمی طورپر واثق یقین ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ میل ملاپ ہوگیا ہےاوروہ نجات یافتہ ہے ۔ (افسیوں ۲: ۱۶، ۱۷۔ رومیوں ۵: ۱) اس حالتِ قلب کا نتیجہ قدرتاً انسانی احساس اور شعور پر پڑتا ہے کیونکہ خدا سے میل ملاپ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو" خداکا اطمینان حاصل ہوتا ہے جوفہم سے بھی پرے ہے۔ اورہمارے دلوں اورخیالوں کی نگہبانی کرتا ہے"(فلپیوں ۴: ۷)۔ یہ اندرونی سلامتی روح القدس کاپھل ہے (گلتیوں ۵: ۲۲) اوراُس خوشی کی جزو لائینفک ہے جو ایمان کے باعث ہم کوحاصل ہوتی ہے(رومیوں ۱۵: ۱۳)۔

عربِ جاہلیت "السلام علیکم" نہیں کہتے تھے بلکہ وقت کے مطابق سلام کی جگہ انعمہ صبا حاً انعمہ مساء اورانعمہ ظلاماً کہتے تھے جو انگریزوں کے مروجہ گڈمارننگ ، گڈ ایوننگ اورگڈ نائٹ کے ہم معنی ہیں۔ لیکن چونکہ عرب میں آنحضرت کے زمانہ میں اہلِ کتاب بکثرت آباد تھے(خطبات احمدیہ خطبہ سوم) جو ملاقات کے وقت اور رخصت کے موقعہ پر ایک دوسرے کو"سلام علیکم" کہا کرتے تھے آنحضرت کو یہ کلمہ عرب جاہلیت کےکلمہ سے زیادہ پسند آیا۔ پس آپ نے اس کو ترجیح دی اوراُس اُمی قوم عرب کو مذہب اور تہذیب کا سبق سکھلا کر اُن کوحکم دیاکہ عیسائیوں کی تقلید میں اسلام علیکم کہا کریں۔ مولوی صاحب انجان بن کر بھول گئے کہ عیسائی اس معاملہ میں

مسلمانوں کے استاد ہیں اورالٹا عیسائیوں کو سبق دینے چلے سچ ہے ۔

کس نیا موخت علم تیرازمن
که عاقبت مرانشانه فکرد

اُمید ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کے مقلدین اب سمجھ گئے ہونگے کہ عیسائیوں کا سلام کیا ہے اوران کا مذہبی طریق کیا ہے اورعیسائیوں کےسلام کا مفہوم کس قدر گہرا اور روحانی ہے۔

رب السلام نفسه یعطیکمه السلام دائماً من کل وجه
(۲تھسلنیکیوں۳:۱٦)

"وہ زندوں اورمُردوں کی عدالت کے لئے آنے والا ہے"

عدالتِ خداوندی

مسیحیت کا اصل الااُصول یہ ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے (۱یوحنا ۴: ۱٦، ۱۸، ۲کرنتھیوں ۱۳: ۱۱وغیرہ) خدا کی تمام صفات اُس کی ذات یعنی محبت کی صفات ہیں۔ خدا کی ذات اورصفات انسانی حدود اورزمان ومکان کی قیود کے اندر ربنا المسیح کی زندگی، موت اورظفریاب قیامت میں بدرجہ احسن ظہورپذیر ہوئیں۔

الہٰی صفات میں سے ایک صفت خدا کی قدوسیت ہے۔ جو دیگر الہٰی صفات کی طرح خدا کی ذات یعنی الہٰی محبت سے تعلق ہے۔ خدا کی محبت قدوس اورپاک محبت ہے ۔ بالفاظِ دیگر خدا کی محبت تمام روحانی خوبیوں اور اخلاقی نیکیوں کا سرچشمہ ہے ۔ گناہ اوربدی کا اس سے بالکل تعلق نہیں۔اسلام اورقرآن کے مطابق خدا،نیکی اوربدی دونوں کا سرچشمہ ہے لیکن انجیل جلیل کی تعلیم اس کے عین خلاف ہے۔"خدا نور ہے اوراس میں ذرا بھی تاریکی نہیں"(۱یوحنا ۱: ۵ وغیرہ) پس خدا کی قدوس محبت ہر قسم

کی خوبی اورنیکی کا سرچشمہ اورمنبع ہے اور ہرقسم کی بدی کے عین نقیض ہے۔

اس دنیا میں خدا کی قدوسیت زمان ومکان کی حدود کے اندرہم کو نظر آتی ہے ۔ خدا نے اس دنیا کا نظام ایسا قائم کیا ہے ۔ کہ اس کے اٹل قوانین اُس کی قدوسیت کے مظہر ہیں(زبور۱۱۹: ۸۹ ، ۹۰، ۱پطرس ۱: ۲۵ ، متی ۲۴: ۳۵وغیرہ)۔ قوانینِ فطرت کا مطالعہ خدا کی قدوس ذات کو بنی نوع انسان پر ظاہر کردیتا ہے اقوامِ عالم کی تاریخ ہم پر یہ بات روشن کردیتی ہے۔ کہ جو اقوام خدا کی محبت اور پاك مرضی پر عمل کرتی ہیں۔ وہ زندہ رہتی ہیں اورشاہراہ ترقی پر قدم مارتی ہیں۔ لیکن جو افراد اس پر عمل نہیں کرتے وہ نیست ونابود ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے "بدکاری اورناپاکی کا انجام موت ہے۔ لیکن پاکیزگی کا انجام ہمیشہ کی زندگی ہے" (رومیوں ۱٦: ۲۱، ۲۲) یہ الہیٰ قانون اٹل ہے کیونکہ وہ خدائے لایزال کی ذات مظہر ہے" گناہ کے سبب موت آئی اورسب آدمیوں میں پھیل گئی۔ کیونکہ سب نے گناہ کیا ہے"(رومیوں ۵: ۱۲)۔" خدا ہرایك کو اس کے کاموں کے موافق بدلہ دے گا۔ جونیکوکاری میں ثابت قدم رہ کر جلال اورعزت اور بقا کے طالت ہوتے ہیں اُن کو ہمیشہ کی زندگی دیگا۔ لیکن بدکار کی جان پر آئیگی۔ کیونکہ خدا کے ہاں کسی کی طرفداری نہیں "(رومیوں ۲: ۷تا ۱۱) چنانچہ کلمتہ اللہ فرماتے ہیں " اگر تم ایمان نہیں لاؤگے تو اپنے گناہوں میں مروگے"(یوحنا ۸: ۲۴)۔ پھر اس اٹل الہیٰ قانون کو ایك مثال سے واضح کرکے فرماتے ہیں "کیا جھاڑیوں سے انگوراوراونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں ؟ اسی طرح ہرایك اچھا درخت اچھل پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لاسکتا اور نہ بُرا درخت اچھا پھل لاسکتا ہے۔ پس ان کے پھلوں سے تم اُن کوپہچان لوگے"(متی ۷: ۱٦، ۲۰، لوقا ٦: ۴۳ وغیرہ)۔

پس خدا کی محبت کی قدوسیت خدا کی عدالت میں ظاہر ہوتی ہے اورعدالت کا معیاراقوام اورافراد کےلئے ایك ہی ہے " بدکاری اورناپاکی کا انجام موت ہے ۔لیکن پاکیزگی کا انجام ہمیشہ کی زندگی "(رومیوں ٦: ۲۱، ۲۲) " جو درخت اچھاپھل نہیں لاتا وہ کاٹا اورآگ میں ڈالا جاتا ہے"(متی ۷: ۱۹)

اقوامِ عالم کی تاریخ اس ایک اٹل الہٰی قانون کی زندہ مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جس سے بنی نوع انسان عبرت حاصل کرسکتے ہیں۔ عہدِ عتیق کی کُتُب کا مطالعہ اسی ایک حقیقت کوظاہر کرتا ہے کہ جب بنی اسرائیل خدا کی مرضی اوراحکام کے تابع رہے۔ اُن کی قوم ترقی کرتی رہی۔ لیکن جب اُنہوں نے الہٰی احکام کو پس پشت پھینک دیا تو وہ قعرذلت میں گرفتار ہوگئے۔ غضب الہٰی اسی قانون قدرت کا دوسرا نام ہے پروردگارِعالم نے ایسا انتظام کررکھا ہے کہ جو اقوام یا افراد الہٰی احکام کا عدول کرکے الہٰی محبت سے منہ موڑتے ہیں۔ وہ اپنے کئے کی سزا پاتے ہیں۔ " خداوند ایک دیوار پر جو ساہول سے بنائی گئی تھی کھڑا ہے۔ اورساہول اُس کہ ہاتھ میں ہے (عاموس ۷: ۱۷) خدا ایک ہی ساہول اورمعیار سے دنیا کی اقوام اورممالک کو جانچتا ہے ہر انسانی، سیاسی اورمعاشرتی اقتصادی نظام اسی ایک معیار سے پرکھا جاتا ہے اورجس طرح وہ دیوار جوساہول سے نہ بنائی جائے ٹیڑھی ہوجاتی ہے اورجب کج دیوار ایک خاص اندازہ سے بڑھ جاتی ہے تو اپنے وزن سے خودہی گرجاتی ہے اسی طرح ہر ایک انسانی امر جو الہٰی محبت کے قوانین کے مطابق نہیں بنتا۔ وہ قدرتی طورپر خود بخود فنا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ پروردگار نے عالم کا انتظام ہی اس قسم کا رکھا ہے۔ اس الہٰی غضب سے ہم ہرگز نہیں بچ سکتے۔" خدا کا غضب اُن آدمیوں کی تمام بے دینی اورناراستی پر آسمان سے ظاہر ہوتا ہے جو حق کو ناراستی سے دبائے رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا تویہ سمجھتا ہے کہ تو خدا کی عدالت سے بچ جائیگا۔ بلکہ تو اپنی سختی اورغیر تائب دل کے مطابق اُس قہر کے دن کیلئے غضب کمارہا ہے جس میں خدا کی سچی عدالت ظاہر ہوگی۔ وہ ہر ایک کو اس کے کاموں کے موافق بدلہ دیگا" (رومیوں ۱، ۲) لہذا رسول مقبول اپنے مسیحیوں کو کہتا ہے " عزیز فرزندوں کی طرح خدا کی مانند بنو اورمحبت سے چلو اور جیساکہ مقدسوں کو مناسب ہے ۔ تم میں حرامکاری اورکسی طرح کی ناپاکی کا ذکر تک نہ ہو۔ کوئی تم کو بے فائدہ باتوں سے دھوکا نہ دے ۔ کیونکہ انہی گناہوں کے سبب سے نافرمانی کے فرزندوں پر خدا کاغضب نازل ہوتا ہے (افسیوں ۵باب) پس مسیحیت کے مطابق الہٰی غضب کسی برترہستی کے انتقام پر مشتمل نہیں۔ کیونکہ

انتقام کا جذبہ خدا کی محبت کے منافی ہے۔ بلکہ وہ خدا کی محبت کی قدوسیت اورپاکیزگی کا فطرتی اور قدرتی نتیجہ ہے۔ کیونکہ " پاکیزگی کا انجام ہمیشہ کی زندگی ہے۔لیکن" گناہ کی مزدورموت ہے " یہ اٹل قانون قدرت ہے۔

(۲۔)

یہاں ہم یہ عرض کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ الہٰی غضب فطرت کااٹل قانون ہے توہم اُن قوانین کو ایک غیر مشخص بالا اوربرترہستی قرارنہیں دیتے جن کی زد سے کسی انسان کو قرارنہیں ہوسکتا۔ ہم اہلِ ہنود کی طرح کرم کی تعلیم کے قائل نہیں۔ ہم دنیاوی اورمادی اسباب وعلل کو وہ جگہ اور رتبہ نہیں دیتے ۔ جو صرف مستبب الاسباب کوہی شایاں ہے۔ ہم کسی تقدیر مبرم اورعقیدہ جبر کے قائل نہیں۔ بلکہ اُس واحد ہستی کے قائل ہیں۔ جس کی ذات محبت ہے اورجس کی صفات مادی اسباب وعلل میں ہم نظر آتی ہیں" آسمان خدا کا جلال بیان کرتے ہیں اورفضاء اُس کی دستکاری دکھاتی ہے" خدا کی محبت کی پاکیزگی اور قدوسیت ظاہرکرتی ہے کہ" خداوند کی عدالتیں سچی اورتمام وکمال سیدھی ہیں"اوران کو" ابد تک پائداری حاصل ہے"(زبور ۹:۱۹)۔

(۳۔)

ہم اس مضمون کے شروع میں کہہ چکےہیں کہ مسیحیت اس بات کی قائل ہے کہ خداکی ذات اورصفات زمان ومکان کی قیود کے ماتحت انسانی حدود کے اندر ربنا المسیح کی مبارک زندگی ، موت اور قیامت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ جب ہم انجیل جلیل میں ابن اللہ کی محبت بھری زندگی کودیکھتے ہیں تو ہم خدا کی محبت کا تصورباندھ سکتے ہیں۔ جب ہم چاروں انجیلوں میں اس کی قدوس زندگی پر نظر کرتے ہیں ۔ توہم پریہ ظاہر ہوجاتا ہے ۔ کہ خدا کو گناہ اوربدی سے نفرت ہے۔ کیونکہ وہ نیکی کا سرچشمہ ہے۔سیدنا مسیح کی زندگی ایک نورہے جس کی روشنی میں عاجزانسان حقیقی نیکی کے مفہوم کو کماحقہ سمجھ سکتاہے۔ کلمتہ اللہ نے علی اعلان فرمایا" دنیا کا نورمیں ہوں، جومیری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلیگا ۔ بلکہ زندگی کا نورپائیگا"(یوحنا ۸: ۱۲) مقدس یوحنا انجیل نویس فرماتاہے " اُس میں زندگی تھی اور

وہ زندگی آدمیوں کا نور تھا۔ نورتاریکی میں چمکتا ہے "(یوحنا ۱: ۴، ۵) کلمتہ اللہ کے مبارک اقوال وافعال" اقوام عالم کو روشنی دینے والے نور ہیں" جوہر ایک شخص کی زندگی کی عدالت کرتے ہیں۔ سیدنا مسیح کے خیالات کلمات ، جذبات اورافعال کی روشنی میں ہر شخص اپنے خیالات اور زندگی کو پرکھ سکتا ہے اورمعلوم کرسکتا ہے کہ آیا مجھ میں تاریکی ہے یا نہیں۔ کیونکہ"جو خدا سے ہوتا ہے ۔ وہ خدا کی باتیں سنتا ہے "(یوحنا ۸: ۴۷) چنانچہ ابن اللہ نے رومی گورنر پلاطوس تک کو فرمایا" میں اسلئے پیدا ہوا اوراس واسطے دنیا میں آیا ہوں کہ حق کی گواہی دوں۔ جو کوئی سچائی کا ہے وہ میری آوازسنتا ہے"(یوحنا ۱۸: ۳۷) پھر اہلِ یہود کو مخاطب کرکے فرمایا" جب تک نورتمہارے ساتھ ہے۔ چلے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ تاریکی تم کوآ پکڑے"(یوحنا ۱۲: ۳۵)۔ مقدس یوحنا انجیل نویس فرماتا ہے کہ کلمتہ اللہ کی مبارک زندگی " آدمیوں کا نورتھا اورنورتاریکی میں چمکتا ہے ۔ اورتاریکی نے اُسے قبول نہ کیا" (یوحنا ۱: ۵) پھر فرماتا ہے کہ جو لوگ "دنیا سے ہیں وہ دنیاکی سی کہتے ہیں اوردنیا اُن کی سنتی ہے۔ ہم خدا سے ہیں۔ جوخداکو جانتا ہے وہ ہماری سنتا ہے جو خدا سے نہیں وہ ہماری نہیں سنتا ۔ اسی سے ہم حق کی روح اورگمراہی کی روح کو پہچان لیتے ہیں"(۱یوحنا ۴: ۵تا ۷)۔پس کلمتہ اللہ کی زندگی ایک ایسی کسوٹی ہے جونیک وبد کے پرکھنے میں کبھی خطا نہیں کرتی۔ آپ کے خیالات اور جذبات ، کلمات طیبات اورجلال افعال ، بنی نوع انسان کے جذبات ،اقوال اورافعال کی عدالت کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نےفرمایا "میں دنیا میں عدالت کے لئے آیاہوں" (یوحنا ۹: ۳۹) " باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا ۔ بلکہ اُس نے عدالت کا ساراکام بیٹے کے سپرد کردیا۔ اُس نے اُس کو عدالت کرنے کا اختیاربخشا ہے کیونکہ وہ ابن آدم (انسانِ کامل) ہے"(یوحنا ۵: ۲۲، ۲۷) مقدس پطرس جس نے ابن اللہ کی زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا فرماتا ہے" سیدنا مسیح وہی ہے جو خدا کی طرف سے زندوں اورمُردوں کا منصف مقررکیا گیا ہے"(اعمال۱۰: ۴۲) مقدس پولوس بھی فرماتا ہے" خدا راستی سے دنیا کی عدالت یسوع کی معرفت کریگا"(اعمال۱۷: ۳۱)" ضرور ہے کہ مسیح کے تختِ عدالت کے سامنے جاکر ہم سب کا حال ظاہر کیا

جائے" (۲کرنتھیوں ۱۵: ۱۰)۔ یہ اُن لوگوں کی گواہی ہے جنہوں نے کلمتہ اللہ کو خود سنا اوراپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا اوراپنے ہاتھوں سے چھوا" (۱یوحنا۱: ۱) اُنہوں نے تین سال کا ایک ایک لمحہ ابن اللہ کی صحبت میں کاٹا تھا۔ اورجب وہ اپنی زندگی کو آپ کی قدوس زندگی کے آئینہ میں دیکھتے تھے تو وہ بے اختیار کہتے تھے "اے خداوند میں گنہگار آدمی ہوں" (لوقا ۵: ۸) "یہ بات سچ اورہر طرح سے قبول کرنے کے لائق ہے۔ کہ مسیح یسوع گنہگاروں کو نجات دینے کے لئے دنیا میں آیا۔ جن میں سب سے بڑا میں ہوں" (۱تمتھیس۱: ۱۵) قدیم زمانہ میں اسی طرح حضرت یسعیاہ پکار اٹھے تھے۔ جب اُنہوں نے الہٰی قدوسیت کا جلال دیکھاتھا۔ " تب میں چلایا۔ ہائے مجھ پر میں توبرباد ہوا۔ کیونکہ ناپاک ہونٹوں والاآدمی ہوں" (۶باب)کلمتہ اللہ کی جلالی اور قدوس زندگی نے ہر شخص کی جوآپ کے پاس آیا عدالت کی(متی ۹: ۲، ۱۲- ۱۲: ۳۴، ۱۶: ۴- ۲۱: ۴، ۴۰، ۲۳باب ، ۲۶: ۲۵، ۲۷: ۴ لوقا ۷: ۳۸- ۱۱: ۳۹ تا ۱۲: ۷، ۱۵باب ۱۶: ۱۵، ۱۹: ۸، ۱۰- یوحنا ۳: ۱- ۲۱، ۴: ۲۹، ۵: ۱۵- ۸: ۱، ۱۰، ۴۴، ۴۶، ۹: ۴۱- مرقس ۱۴: ۲۷ وغیرہ)۔ ہر شخص اپنی گھناؤنی زندگی پر نظر کرکے توبہ کرتا اوراپنے گناہوں سے نجات پانے کا جانفزا مژدہ سن کر خدا کی بادشاہت کا وارث ہوجاتا تھا لیکن جو لوگ اپنے دلوں کو سخت کرکے دیدہ دانستہ توبہ نہیں کرتے تھے۔ اُن کو بھی اپنی زندگیاں نفرت انگیز نظر آتی تھیں (یوحنا ۸: ۱، ۱۰ وغیرہ) خداوند فرماتے تھے کہ اُن کی عدالت زیادہ سخت ہوگی (متی ۱۱: ۲۰، ۲۴، ۱۲: ۴۱- ۴۵ ۔لوقا ۱۳: ۱تا ۵- ۲۰: ۱۶تا ۱۸ وغیرہ) ابن اللہ اُن کی دل کی سختی پر باربار تعجب کرتے اوراظہارِ افسوس کرتے تھے۔ اوراُن کے اعمال کی پاداش پر روتے تھے" جب اُس نے نزدیک آکر یروشلیم کودیکھا تو رویا اور کہا کہ کاش کہ تو اپنے اسی دن میں سلامتی کی باتیں جانتا۔ مگر اب وہ تیری آنکھوں سے چھپ گئی ہیں۔ کیونکہ وہ دن تجھ پر آئینگے کہ تیرے دشمن تیرے گرد مورچہ باندھ کر تجھے گھیرلیں گے اورہر طرف سے تنگ کریں گے اور تجھ کو اورتیرے بچوں کو زمین پر دے پٹکیں گے ۔ اورتجھ میں کسی پتھر پرپتھر باقی نہ چھوڑیں گے ۔ اس لئے کہ تو نے اُس وقت کو نہ پہچانا ۔ جب تجھ پر نگاہ کی گئی ۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے۔ جب تک نہ کہو گے

کہ مبارک ہے۔ وہ جو خداوند کے نام پر آتا ہے"(لوقا ۱۹: ۴۱، ۴۴ ۔ متی ۳۳: ۳۷، ۳۹ وغیرہ) تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ یروشلیم اورقوم یہود کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اُن کے مصائب وآلام سیدنا مسیح کی وفات کے بعد شروع ہوگئے اورتاحال ان کا خاتمہ نظر نہیں آتا۔

ان کی وجہ یہ نہیں کہ خدا ذوالانتقام ہے۔ اوروہ بدلہ لیتا ہے۔ اس قسم کی دلیل لانے والے خدا کو اپنا سا انسان سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خداوندفرماتا ہے " تونے یہ کیا۔ تونے گمان کیاکہ میں تجھی سا ہوں "(زبور ۵۰: ۲۱) کلمتہ اللہ کے الفاظ میں وہ خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتے ہیں(متی ۱۶: ۲۳) کیونکہ جو جسمانی ہیں وہ جسمانی باتوں کے خیال میں رہتے ہیں "(رومیوں ۸: ۵) یروشلیم اورقوم یہود کی تباہی خدا کی محبت کی قدوسیت کے قوانین کی خلاف ورزی کی ایک بین مثال ہے۔ زبورنویس ایسے ہی حالات میں اقرارکرتا ہے"اے خداوند میں جانتاہوں کہ تیری عدالتیں راست ہیں۔ اورکہ تونے وفاداری سے مجھ پر تباہی بھیجی"(زبور ۱۱۹: ۷۵) اعمال کی مکافات محض سزا دینے کی خاطر نہیں۔ بلکہ اصلاح کی خاطر تنبیہ ہے۔ چنانچہ امثال کا مصنف نصیحت کرتا ہے"اے میرے بیٹے خداوند کی تنبیہ کو حقیر مت جان اوراُس کی تادیب سے بے دل مت ہو کیونکہ جس سے خداوند محبت رکھتا ہے اُسے تنبیہ بھی کرتا ہے ۔ جس طرح باپ اُس بیٹے کو جس سے وہ خوش ہے(۱۳: ۱۱، ۱۲) اورعبرانیوں کا مصنف کہتا ہے" ہر قسم کی تنبیہ خوشی کا نہیں۔ بلکہ غم کا باعث معلوم ہوتی ہے مگر جواس کے سہتے سہتے پختہ ہوگئے ہیں۔ اُن کو بعد میں چین کے ساتھ راستبازی کاپھل بخشتی ہے" (۱۲: ۱۱)۔

(۴۔)

پس جو گنہگار اپنے اعمال کےنتائج کو دیکھ کر خلوصِ دل سے توبہ کرتے ہیں۔ خدا کی محبت اُن کواپنے فضل وکرم سے گناہ کے بند اورقید کی غلامی سے نجات بخشتی ہے۔ اور اس کو اس قابل بنادیتی ہے کہ اس کی مردہ روح میں زندگی پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کلمتہ اللہ فرماتے ہیں" میں تم سے سچ سچ کہتاہوں کہ جو میرا کلام سنتا اورمیرے بھیجنے والے کا یقین کرتا ہے ہمیشہ کی زندگی اُسی کی ہے اوراس پر سزا کا حکم

نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ مُردے خدا کے بیٹے کی آواز سنینگے۔ اورجو سنینگے وہ زندہ ہوجائینگے "(یوحنا ۵: ۲۴، ۲۵) آپ نے فرمایا کہ" قیامت اور زندگی میں ہوں جو مجھ پر ایمان لاتا ہے ۔ گو وہ مرجائے تو بھی زندہ رہیگا۔ اورجوکوئی زندہ ہے اورمجھ پر ایمان لاتا ہے وہ ابد تک کبھی نہ مریگا(۱۱: ۲۵) ہر شخص کو جو اپنے گناہوں کے ہاتھوں مجبورہے یہ تجربہ ہے ۔ کہ" میں جسمانی اورگناہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوں جس کا میں ارادہ کرتاہوں وہ نہیں کرتا بلکہ جس سے نفرت ہے وہی کرتاہوں۔ گناہ مجھ میں بسا ہوا ہے ۔ میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں۔ البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے ۔ مگرنیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے ۔ چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتاہوں وہ تو نہیں کرتا۔ مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتاہوں۔ جب نیکی کا ارادہ کرتاہوں تو بدی میرے پاس آموجود ہوتی ہے ہائے میں کیسا کم بخت آدمی ہوں۔ اس موت سے مجھ کو کون چھڑائے گا"؟ ایسی حالت میں سیدنا مسیح کا فضل گنہگار کے شامل حال ہوتا ہے۔ اوراُس کو خوفناک غلامی سے چھڑاتا ہے۔ کیونکہ" گناہ" کی مزدوری موت ہے۔ مگر خدا کی بخشش ہمارے سیدنا مسیح میں ہمیشہ کی زندگی ہے"(رومیوں ۶: ۲۳)۔

خدا کا غضب

انجیل جلیل کی تعلیم کا مرکزی اُصول یہ ہے کہ" خدامحبت ہے" (۱یوحنا ۴: ۸) مسیحیت کا تمام دارومدار اسی ایک اصول پر ہے۔ کہ خدائے واحد کی ذات محبت ہے۔ اورمسیحی عقائد کو سمجھنے کی یہی ایک کنجی ہے۔ اگر کوئی شخص اس اصل الاصول کو نظر انداز کرکے کسی مسیحی مسئلہ پر بحث کرتا ہے۔ توممکن ہے کہ وہ اپنی خداداد عقل کے جوہر سے لوگوں کو مرعوب کردے۔ لیکن وہ اس مسئلہ کو انجیل جلیل کے پیغام کے مطابق حل کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

(۲۔)

مقدس یوحنا اورمقدس پولوس دونوں اپنی تحریرات میں اس اصل کے ذریعہ مسیحیت کے پیغام کی تشریح کرتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ "خدا کے غضب" کا بھی ذکر کرتے ہیں (رومیوں ۱: ۱۸، یوحنا ۳: ۳۶)پس سوال یہ پیدا

ہوا ہے کہ اگر خدا محبت ہے تو خدا کے غضب کا کیا مطلب ہے؟ ہمارے ذہن یہ قبول نہیں کرتے کہ ایک ہی ہستی میں محبت اور غضب دونوں موجود ہوں کیونکہ ہم یہ فرض کرلیتے ہیں، کہ محبت اور غضب دومتضاد صفات ہیں۔ جو ایک ہی ہستی میں موجود نہیں ہوسکتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم الہٰی غضب کو انسانی غضب کے مطابق تصورکرلیتے ہیں ۔ہم یہ فراموش کردیتے ہیں کہ انسانی غضب میں گناہ کا عنصر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں انتقام کا جذبہ عموماً موجود ہوتا ہے ۔ جس غضب سے ہم واقف ہیں اُس میں بدلہ لینے کی خواہش اورمنتقمانہ سزا دینے کا خیال تقریباً ہمیشہ ہوتا ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ انسانی غضب ہر قسم کے جوروظلم ، تند مزاجی ،کینہ، بغض اورحسد ،نفرت اور جنگجوئی وغیرہ کا سرچشمہ ہے۔ اوراس کی نشوونما اورترقی بھی انہی جذبات پرمنحصر ہے پس کتاب مقدس میں باربار غصے ، غیظ اور غضب کے خلاف تاکیدًا تنبیہ کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد فرماتے ہیں " غصہ کرنے سے بازآاور غضب کو ترک کر"(زبور۳۷: ۸) حضرت سلیمان کہتے ہیں " غضب سخت بے رحمی ہے اورقہرایک سیلاب ہے"(امثال ۲۷: ۴)۔ مقدس پولوس اس کو" جسم کےکاموں" میں شمار کرتے ہیں جن کی نسبت وہ فرماتے ہیں کہ " ایسے کام کرنے والے خدا کی بادشاہت کے وارث نہ ہوں گے"(گلتیوں ۵باب) پھر تاکید کرکے فرماتے ہیں کہ" غصہ اورقہر وغیرہ کے سبب خدا کا غضب نافرمانی کے فرزندوں پر نازل ہوتا ہے" (کلسیوں ۳: ۶تا ۸)۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ غضب کی ایک قسم بھی ہے جو صالح ہے اورجس کو عموماً راستبازنہ غصہ کہا جاتا ہے جوجائز ہے لیکن یہ صوابکاری کا غضب شاذونادرہی انسانی تجربہ میں آتا ہے ۔ اسی قسم کے غضب کی بابت حضرت داؤد فرماتا ہے"انسان کا غضب خدا کی ستائش کرے گا"(زبور ۷۶: ۱۰) اس قسم کے غضب کی اعلیٰ ترین مثال ہم کو ابن اللہ کی مبارک زندگی میں ملتی ہے۔ لکھا ہے کہ آپ ایک دفعہ خدا کی ہیکل میں تشریف لے گئے۔ وہا ں جاکر کیادیکھتے ہیں کہ جوجگہ غیر یہود کی عبادت کےلئے مخصوص تھی۔ اس کو سردار کاہنوں نے تجارت کا ذریعہ اورمنفعت کا وسیلہ

بنارکھا ہے اورنمازیوں کی بجائے وہاں بیل اوربھیڑیں ،کبوتر اور صراف وغیرہ ہیں۔ابن اللہ کی غیرت جوش زن ہوئی آپ کے ہاتھ میں ایک رسی تھی۔ آپ نے اسکوکوڑے کے طورپر استعمال کرکے بھیڑوں، بیلوں وغیرہ سب کو نکال دیا۔ اور زبان معجز بیان سے فرمایا "ان کویہاں سے لے جاؤ میرے باپ کے گھر کو تجارت کا گھر نہ بناؤ۔ خداوند فرماتا ہے کہ میرا گھر اقوام عالم کےلئے دعا کا گھر ہوگا۔لیکن تم نے اُسے ڈاکوؤں کی کھوہ بناتے ہو" (متی ۲۱باب ۔ یوحنا ۲باب)۔

اکثر اوقات جب ہم غضب ناک ہوتے ہیں تواپنے غصے کوحق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں اوراپنے آپ کو فریب دے کریہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا غصہ صوابکاری اورراستی کا غصہ ہے۔ لیکن جب ہم حق کے آئینہ میں اس جذبہ کو دیکھتے ہیں توہم پریہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہمارے جذبہ میں خودی کا عنصر موجو دہے۔ اورہمارے غضب کااصلی سبب یہ ہے کہ ہماری خودی اورخودنمائی کوکسی نہ کسی طرح سے ٹھیس لگی ہے جس سے ہمارے دل میں انتقام لینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اورجس چیز کو ہم غیرت الٰہی کی طرف منسوب کرتے تھے ۔ وہ درحقیقت الٰہی باتوں سے کوسوں دورہوتی ہے اورکہ ہمارا غصہ خدا کی طرف سے نہیں۔بلکہ شیطانی وسوسہ کا نتیجہ ہے۔

چونکہ انسانی تجربہ میں راستبازی کا غصہ کالنادرفے المعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے ہم الٰہی غضب کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔اوریہ خیال کرتے ہیں کہ خدا جس کی ذات محبت ہے اس کی صفت غضب نہیں ہوسکتی ۔

(۳۔)

ایک اورسبب ہے جس کی وجہ سے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ محبت اور غضب کے جذبے ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ غیر مسیحی مذاہب اوربالخصوص اسلام نے جو قہرالٰہی کا تصورہمارے سامنے پیش کیا ہے۔اس کے خیال ہی سے انسان پر دہشت چھا جاتی ہے۔اوربدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ازروئے قرآن خدا ایک قہارہستی ہے اورانسان مقہور ہے۔ خدا ضرر پہنچانے والا اورگنہگاروں کو فنا کردینے والا حاکم ہے۔ جس نے جہنم سزادینے کی غرض سے پیدا رکھا

ہے قرآن میں سزا کا بیان پڑھنے سے جسم پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا غضب خدا کی محبت کے منافی ہے۔ اورجب انجیل جلیل میں خدا کے غضب کا ذکرآتا ہے۔ تو اِن الفاظ کا وہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا جواسلام اورقرآن کا مطلب ہوتا ہے۔ اس قسم کے غضب میں انتقام کا عنصر غالب ہے اور سزا کا واحد مقصد بدلہ لینا ہوتا ہے جومحبت کے منافی ہے۔ محبِ صادق اپنے محبوب سے انتقام نہیں لیا کرتا۔

(۔۴)

ہم اس حقیقت کو ایک دینوی مثال سے واضح کرتے ہیں۔جب کسی باپ کا بچہ آوارہ ہوکر شیطانی افعال کا مرتکب ہوتا ہے تو باپ اس محبت کی وجہ سے جو وہ اُس کے ساتھ کرتا ہے۔ اُس سے غصہ ہوتا ہے پس باپ کا غضب درحقیقت اُس کی محبت کی آگ چنگاری ہے اوراگر وہ اپنے بیٹے کوسزا دیتا ہے۔ تواس کا مقصد انتقام اوربدلہ لینا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیٹے کی زندگی کی اصلاح ہوجائے اوراس کی عادتیں سنور جائیں۔ اوروہ راہِ راست پر چلے۔ باپ کی محبت اوراُس کا غضب دومتضاد باتیں نہیں ہوتیں۔اس کے برعکس باپ کا غضب اس کی محبت کا ظہورہے۔جس کا مقصد بیٹے کی اصلاح ہے۔ پس باپ کی محبت اورباپ کا غضب درحقیقت ایک ہی تصویر کے دورُخ ہیں۔ اگرایک زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو وہ باپ کی محبت ہے۔ لیکن دوسرے زوایہ نگاہ سے وہی چیز باپ کا غضب ہے۔

یہ دینوی مثال جوہر روز ہمارے تجربہ میں آتی ہے ہم کوالہٰی محبت اورالہٰی غضب کے صحیح مفہوم سمجھنے میں مددیتی ہے۔ خدامحبت ہے۔ لیکن جب اُس کا گنہگار فرزند اُس کی راہ کو ترک کرکے شیطان کے پیچھے چلتا ہے تو الہٰی محبت کی آگ کی چنگاریاں الہٰی غضب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں پس خدا کی محبت اورخدا کا غضب دومتضاد چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ غضب محبت کا ظہور ہے ۔ اوریہ غضب منتقمانہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی غائیت گنہگارانسان کی اصلاح ہے۔ اسی واسطے انجیل جلیل میں الہٰی غضب کا نام" برے کا غضب" رکھا ہے(مکاشفہ ۶: ۱۶)۔ اس غضب کا

مقصد گنہگار انسان کو فنا کرنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا ہر گنہگار سے محبت رکھتا ہے (یوحنا ۳: ۱۶) اور چاہتا ہے کہ" شریر اپنی شرارت سے باز آئے اور زندہ رہے"۔

پس صحیح معنوں میں غضب اور محبت میں تضاد نہیں ہے۔ محبت کا تضاد و غضب نہیں بلکہ بے اعتنائی بے توجہی اور بے پروائی ہے۔ اگر الہٰی محبت کا ظہور غضب میں نہیں ہوتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا گناہ کے معاملہ میں بے پرواہ ہے۔ اور اگر اس کا کوئی فرزند گمراہ ہو کر بدی کرتا ہے تو اس کو بالکل پرواہی نہیں ہوتی ۔ جس طرح سوتیلے باپ کو پروا نہیں ہوتی ۔ جب اس کا سوتیلا بیٹا شیطانی افعال کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ سوتیلا باپ اس معاملہ میں بے اعتنائی اور بے توجہی اختیار کر لیتا ہے ۔ کیونکہ وہ محبت نہیں کرتا۔ لیکن وہ اپنے سگے بیٹے کی طرف سے بے پرواہ نہیں ہوتا۔ پرچونکہ اُس سے محبت کرتا ہے وہ اُس سے ناراض ہوتا ہے تاکہ بیٹے کی اصلاح ہو جائے۔

پس الہٰی محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے ۔ کہ اس کا ظہور غضب میں ہو۔ اس دنیا میں نیکی اور بدی کی طاقتوں میں جنگ ہو رہی ہے اور کوئی صحیح العقل شخص یہ نہیں مان سکتا کہ اس جنگ میں خدا غیر جانبدار ہو کر بے اعتنائی اختیار کر لیتا ہے ۔ اور اس کو یہ پرواہی نہیں کہ انسان اس جنگ میں اس کی کمان کے ماتحت ہے یا شیطان کے جھنڈے تلے لڑ رہا ہے۔ انجیل جلیل کی یہ تعلیم ہے کہ خدا جو نیکی کا سرچشمہ ہے بدی سے عداوت رکھتا ہے ۔ لہذا وہ نیکی اور بدی کی زبردست جنگ میں بے توجہی اور بے اعتنائی اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ الہٰی غضب اس جانبداری کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن جیسا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں ۔ اس الہٰی غضب میں بدلہ اور انتقام کا رتی بھر عنصر بھی نہیں ہے کیونکہ خدا محبت ہے۔

"بدن کی قیامت اورابدی زندگی "

"جب یہ فانی جسم بقا کا جامہ پہن چکیگا"

قریباً انیس سو سال ہوئے مقدس پولوس نے لکھا تھا" کوئی یہ سول کریگا کہ مُردے کس طرح جی اٹھتے ہیں اورکیسے جسم کے ساتھ آتے ہیں"؟ (۱کرنتھیوں ۱۵: ۳۵)آج بھی اکثرلوگ یہی سوال کرت ہیں(جس کا حال صدیوں سے انجیل جلیل میں پایا جاتاہے)کہ کیا جوجسم جی اٹھیگا بعینہ وہی ہوگا جو صدیوں سے تہ زمین دفن ہوچکاہے یا سپردآتش کیا گیاہے۔ یا مردم خود حیوانوں اورانسانوں نے کھالیا ہے کیونکہ وہ توان کے اپنے جسموں کا حصہ ہوچکا ہے؟

انجیل جلیل کاجواب صاب ہے ۔ کہ یہ جسم جو خون ، گوشت اور ہڈیوں پر مشتمل ہے ۔ وہ بدن نہیں جو جی اٹھتاہے چنانچہ ہمارے آقا ومولا کی زبان صداقت بیان نے فرمایا ہے۔"جو لوگ اس لائق ٹھہرینگے کہ اُس جہان کو حاصل کریں اورمُردوں میں سے جی اٹھیں اُن میں بیاہ شادی نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ پھر مرنے کے بھی نہیں اس لئے کہ وہ فرشتوں کے برابر ہونگے اور قیامت کے فرزند ہوکر خدا کے بھی فرزند وہ ہونگے"(لوقا ۲: ۳۴) مقدس پولوس نہایت واضح الفاظ میں فرماتاہے " گوشت اورخون خدا کی بادشاہی کا وارث نہیں ہوسکتا اورنہ فنا ،بقا کی وارث ہوسکتی ہے"(۱کرنتھیوں ۱۵: ۵۰) مقدس پولوس کا مطلب یہ ہے کہ جومعترض جی اٹھنے والے بدن کی بابت خیال کرتے ہیں کہ وہ بعینہ وہی جسم ہوگا جو سپرد خاک کیا جاتاہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ ذرا قدرت کے نظاروں پر غورکریں۔ ہر موسم بہارمیں ہماری آنکھوں کے سامنے ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں جو جی اٹھنے والے بدن سے کم عجیب نہیں ہیں"اے نادان توخود جوکچھ بوتا ہے ۔ جب تک وہ مر نہ جائے زندہ نہیں کیا جاتا " گیہوں کے کھیت میں یا آموں کے باغ میں پہلے موت نظر آتی ہے۔ اورپھر زندگی رونما ہوتی ہے اناج کا دانہ زمین میں دفن کیا جاتا ہے ۔ وہ پہلے مرجاتاہے تخم کے باہر کا پردہ تحلیل ہوجاتاہے ۔ وہ زمین کے اندرپڑارہ جاتاہے ۔ اوروہیں گل کے سڑجاتاہے۔ اُس کا صرف اصل رہ جاتاہے۔ جس میں نیا جسم بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ باقی سب فنا ہوجاتاہے اوراس میں سے نیا پودا نکلتاہے ۔ لیکن یہ مشابہت

اورمناسبت یہیں ختم نہیں ہوجاتی مقدس پولوس رسول فرماتا ہے" جو توبوتا ہے یہ وہ جسم نہیں جو پیدا ہونے والا ہے" تو یہ اُمید نہیں کرتا کہ جودانہ تونے بویا ہے۔ وہ اسی دانہ کی صورت میں پھر دوبارہ اُگ پڑیگا۔ کیونکہ جب وہ اُگتا ہے تو وہ ایسی صورت اختیارکرلیتا ہے جوبوئے ہوئے دانہ سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ ایساکہ مدفون دانہ میں اورآگے ہوئے پودے میں کسی قسم کی مماثلت نہیں ہوتی۔ اس کی صورت اورشکل رنگ وبو وغیرہ سب میں ایسی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے کہ کسی کے قیاس میں بھی یہ نہیں آسکتا کہ یہ وہی دانہ ہے جو سپردِ خاک کیا گیا تھا۔اس اُگی ہوئی شے کا رنگ شوخ سبز ہوتا ہے وہ زندہ ہوتی ہے اورروزبروزبڑھتی ہی چلی جاتی ہے آموں کا باغ آموں کی گھٹلیوں کے ڈھیرسے کس قدرمختلف ہوتا ہے۔خدا نئی زندگی رکھنے والی شے کو ایسی صورت عطا فرماتا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ اس قانون کے مطابق بڑھتی اورترقی کرتی چلی جاتی ہے۔جو خالق نے اس کےلئے مقررکر رکھا ہے۔خدا نے جیسا ارادہ کرلیا ویسا ہی اُس کو جسم دیتا ہے۔ اور ہر ایک بیج کو اس کا خاص جسم" (آیت۳۹) چنانچہ گیہوں کا پودا روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس میں بالیں آتی ہیں اور وہ ساٹھ گنا اور سو گناپھل لاتا ہے۔

یہی حال مُردوں کی قیامت ہے جوجسم سپردِ خاک یاانذرآتش کیا جاتا ہے وہ گل سڑجاتا ہے لیکن مقررہ وقت پر ایک ایسا بدن جی اٹھیگا جس کی صورت اور شکل اور زندگی کے طورطریق مدفون جسم سے کلیتہً مختلف ہونگے اگرہم نے گیہوں کے سرسبز اور لہلہاتے کھیت نہ دیکھے ہوتے توہماری قوتِ متخیلہ کے کبھی وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا کہ یہ اُن دانوں کا انجام ہے جوہم نے زیرزمین پھینکے تھے۔ اسی طرح ہماری قوتِ متخیلہ اٹھنے والے بدن کی ساخت اور صورت وغیرہ کا قیاس بھی نہیں کرسکتی اور جب دنیا کے کھیت میں خداوند کی آمد کے وقت موسمِ بہار آئیگا اورخدا ہرجسم کے نئی صورت بخشیگا توہم اپنے عزیز واقارب کے نئے بدنوں کودیکھ کر حیران اوردنگ رہ جائینگے۔

(۲۔)

"نفسانی جسم بویا جاتاہے اور روحانی جسم جی اٹھتا ہے جب نفسانی جسم ہے تو روحانی جسم بھی ہے(آیت ۴۴) جو جسم سپردِ خاک کیا جاتاہے وہ "نفسانی" ہے یعنی وہ حواس خسمه خواہشات اوررحجاناتِ کثیف وغیرہ کا اظہار ہے اور بالعموم ہماری یہی فطرت کا آلہ کار ہےایسا جسم سپردِ خاک کیا جاتاہے۔ اوراس کی جگہ "روحانی" بدن جی اٹھتا ہے یعنی ایسا بدن جوروحانی اُموراوراعلیٰ باتوں کا ذریعہ اظہار ہواورہماری روحانی زندگی کی نشوونما اورترقی کاآلہ کارہو وہ ہمارے روحانی مقاصد واغراض کے حاصل کرنے میں ممدومعاون ہو ایساکہ "گوابھی تک یہ ظاہرنہیں ہوا" کہ ہم کیا کچھ ہونگے اتنا ہم جانتے ہیں کہ جب وہ (سیدنا مسیح) ظاہرہوگا توہم بھی اسکی مانند ہونگے"(۱یوحنا ۳: ۲) اس ترقی کاآغازاسی موجودہ جسم کے ساتھ ہوتاہے لیکن اس کا انجام جسم کے بدل جانے اور روحانی بدن اختیار کرنے سے ہوتاہےکیونکہ یہ فانی جسم بہیمی عنصرکی وجہ سے روحانی ترقی کا ذریعہ اظہارنہیں ہوسکتا" ہمارا وطن آسمان پر ہے اورہم ایک منجئی یعنی سیدنا مسیح کےوہاں سے آنے کے انتظارمیں ہیں وہ اپنی قوت کی تاثیرکےموافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کرسکتا ہے ہماری پست حالی کےبدن کی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائیگا"(فلپیوں۳: ۲۰) پس آخرکاراورانجام کارہوگا"روحانی" بدن ہمارے مبارک آقا ومولا کے جلالی بدن کی مانند ہوگا۔جس کا نظارہ مقدس ستفینس نے دیکھا تھا(اعمال۷: ۵۵) اورجس کا جلال مقدس پولوس پر دمشق کی راہ پر چمکا تھا(اعمال۹: ۳ وغیرہ)۔

(۳۔)

ہم نے اُوپر کے فقرے میں لفظ" انجام کار" دیدہ ودانستہ استعمال کیاہے۔کیونکہ یہ بدن منتہائے کمال ہوگا۔ ہمارے موجودہ فانی جسم اوراُس جلالی بدن کے بیچ میں متعدد درمیانی منازل ہیں جو ہماری روحانی ترقی کی مختلف منزلوں کے مطابق ہیں جس روحانی ترقی کی منزل پر ہم پہنچتے ہیں اُسی کے مطابق ہم کو بدن بھی دیا جاتاہے۔ پس درمیانی منزلوں کا ایک بدن دوسرے بدن سےمختلف ہے۔ کیونکہ"

سب گوشت یکساں گوشت نہیں بلکہ آدمیوں کا گوشت اور ہے اورچوپایوں کا اور۔ پرندوں کا گوشت اور ہے۔مچھلیوں گا گوشت اور آسمانی بھی جسم ہیں اور زمینی بھی۔ مگر آسمانیوں کا جلال اورہے زمینیوں کا اورآفتاب کا جلال اورہے مہتاب کا اورستاروں کا جلال اورکیونکہ ستارے ستارے کے جلال میں بھی فرق ہے" (۱کرنتھیوں۱۵: ۳۹) روح کی ترقی کی منزل کے مطابق " خداوند نے جیسا ارادہ کرلیا ویسا ہی اس کو جسم دیتا ہے۔ اورہرایک بیج کو اُس کا خاص جسم" (آیت ۳۸)۔

خداوند مسیح کے مبارک بدن کی مثال اس حقیقت کو واضح کردیتی ہے۔ اناجیل اربعہ کا مطالعہ سیدنا مسیح کی منازل ترقی کو ہم پرظاہرکردیتا ہے ۔سیدنامسیح لڑکپن میں ہی روحانی ترقی کی ایسی منزلوں پر پہنچ گئے تھے کہ آپ "حکمت اورقدوقامت میں خدا کی اورانسان کی مقبولیت میں ترقی کرتے گئے"(لوقا ۲: ۵۲)۔ حتیٰ کہ جوانی کے ایام میں آپ کی آزمائشیں بھی اُس قسم کی تھیں جونہ توجنسی تعلقات سے متعلق تھیں اورنہ انسانی فطرت کے بہیمی عناصر سے اُن کا کچھ لگاؤ تھا(متی ۴: ۱، ۱۱ وغیرہ) جس کا نتیجہ یہ ہواکہ خدا نے آپ کو ایسا جسم اورچہرہ عطا کیا جس میں مقناطیسی کشش تھی۔ آپ کے بشرے سے ایسا جلال ٹپکتا تھاکہ جوبھی آپ کودیکھتا ماں باپ،بیوی بچے ، گھر بار، مال جائداد، سب بھول جاتا اورآپ کے پیچھے ہولیتا(متی ۴: ۲۲، ۸: ۲۲، ۹: ۹) بالفاظِ مقدس یوحنا آپ کے چہرہ مبارک پر" ایسا جلال" تھا جو صرف باپ کےاکلوتے بیٹے ہی کی شایانِ شان" ہوسکتا تھا(۱: ۱۴) جب آپ تیس سال کے ہوئے توآپ نے عالمِ روحانیت کی منازل میں اس قدرترقی کرلی۔ کہ آپ کا جلال "چہرہ سورج کی مانند" چمکتا تھا((متی ۱۷: ۲) جب آپ نے قبرپر فتح پائی توآپ کی جلالی صورت اس قدربدل گئی کہ جو لوگ آپ کی صحبت سے دن رات فیض یاب ہوتے تھے آپ کو نہ پہچان سکے۔(لوقا ۲۴: ۱۸، ۲۷۔یوحنا ۲۰: ۱۵ وغیرہ)لیکن ابھی تک ان چالیس دنوں میں بھی سیدنا مسیح کا بدن اطہرکامل طورپر" روحانی" نہ تھا(یوحنا ۲۰: ۱۷) آپ کے پاکیزہ اورلطیف بدن میں ابھی تک گوشت اورہڈیاں تھیں ۔ آپ کولوگ چھوسکتے تھے آپ کھاپی سکتے تھے"۔خدا نے ایسا ارادہ کیا" ویسا ہی اُس نے

آپ کو بدن عطا کیاتاکہ آپ کے شاگردوں کوآپ کی ظفریاب قیامت کا عینی اوریقینی علم ہوجائے۔لیکن جب یہ چالیس دن ختم ہوگئے تو حضور کے صعودِآسمانی کے موقعہ پرآپ کا بدن اطہرکامل اورمکمل طورپر" روحانی" ہوگیا تھا(لوقا ۲۴: ۵۱ وغیرہ) اسی انتہائی کمال کے واسطے ۴۹ آیت میں پولوس رسول لفظ"آسمانی" استعمال کرتے ہیں۔

ہم اپنے روحانی" بدن کو بھی اس پر قیاس کرسکتے ہیں۔ ہماری روحانی زندگی کی منازل میں جس نسبت سے ہمارا جسم بہیمی عناصر کاآلہ کارنہیں ہوگا بلکہ اعلیٰ ترین اغراض ومقاصد کا ذریعہ اظہارہوگا اُسی نسبت سے " جیسا خدا نے ارادہ کرلیا" ویسا ہی ہماری روحانی ترقی کے مطابق ہم کو روحانی بدن عطا کریگا۔ جوں جوں ہم سیدنا مسیح کے فضل سے معمور ہوکر خدا کے عرفان اورمحبت میں ترقی کرتے جائیں تے توں توں ہمارے بدنوں کی صورت ان درمیانی منازل میں بدلتی جائیگی" جب تک ہم سب کے سب خدا کے بیٹے کے ایمان اوراس کی پہچان میں ایک نہ ہوجائیں اورکامل انسان نہ بنیں یعنی مسیح کے پورے قد کےاندازے تک نہ پہنچ جائیں"(افسیوں ۴: ۱۳)۔

مسئلہ بقا اور سائنس

(۱۔)

اس سے پہلے کہ ہم مادی جسم اورروحانی بدن اوران کے باہمی تعلقات پر غورکریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مادہ اورروح کی حقیقت کو جانیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ روح کیا ہے۔لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم میں روح ہے ۔ توہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم ایک خود شعورہستی ہیں اورہم میں اپنے نفس پر نظر ڈالنے کی صلاحیت موجودہے اس کے علاوہ ہمارا یہ بھی مطلب ہوتا ہے کہ ہماری روح میں تخلیقی قوت موجودہے جوعمل کی بنا ڈالتی ہے، مادہ کو قابو میں رکھتی ہے اوراُس کو اپنے اغراض ومقاصد کےلئے استعمال کرتی ہے۔ روح قوتِ ارادی کو عمل میں لانے کی صفت سے متصف ہے اورا سکی حقیقت آزادی کے تصور کے ذریعہ ہی کامل طوپر بیان میں آسکتی ہے۔ مادہ اور روح دونوں میں سے روح کو

افضلیت اورفوقیت حاصل ہے کیونکہ مادہ صرف ایک ذریعہ ہے جس کے وسیلے روح اپنی اصلی اور ذاتی فاعلیت کا اظہار کرسکتی ہے کیونکہ روح کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنا اظہارکرے، سائنس کی تاریخ درحقیقت مادہ پر قابوحاصل کرنے کی تاریخ ہے اوراس کی ترقی کا انحصاراسی پر ہے۔ کہ مادہ پر زیادہ سے زیادہ قابو پائے۔اگر روح کا مل طورپر قابو حاصل کرلے (جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے مبارک آقا ومولا کو حاصل تھا) توہم جان جائینگے، کہ مادہ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ روح جس طرح چاہے اس کو اپنے ارادے کے مطابق ڈھال لے۔

جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ روح کیا شے ہے اُسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ مادہ کیا چیز ہے۔ لیکن موجودہ سائنس کی روش ہم پر یہ عیاں کردیتی ہے کہ جس شے کو ہم مادہ کہتے ہیں وہ درحقیقت غیر مادی ہے سچ تو یہ ہے کہ مادہ اور قوت (Energy) دونوں کی بابت ہم بہت کچھ نہیں جانتے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہم پہلے جو یہ خیا کیا کرتے تھے کہ مادہ کسی موٹی ٹھوس چیزکا نام ہے وہ غلط ہے،مادہ کی مختلف اشیاء کے انجماداوربھدے پن میں درجوں کا فرق ہے مثلاً لورہے کی سیخ کے ذرات اس قدرگنجان ہوتے ہیں کہ ہم اس کوآسانی سے توڑنہیں سکتے لکڑی زیادہ آسانی سے ٹوٹ جاتی ہے مکھن کے حصے اس سے بھی زیادہ آسانی سے جدا ہوسکتے ہیں ہم دھوئیں کے بادل میں سے بآسانی تمام گزرجاتے ہیں ۔ اوراب ہمارے پاس یہ ماننے کےلئے کافی وجودہ ہیں۔ کہ مادہ مختلف اقسام کا درحقیقت ایک ہی اصل ہے جو مختلف صورتیں اورشکلیں اختیارکرکے مختلف مرکبات میں ہم کو نظر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادہ کی حقیقت کا اصل ہی یہ ہے کہ وہ ایک تغیر پذیر بدلنے والی لچکدار شے ہے جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ہر قسم کی صورت اورشکل اختیارکرے۔

ہم عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ مادی شے زمان ومکان کی قیود سے محدود ہوتی ہے اورکہ وہ مختلف صفتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ صفتیں درحقیقت مختلف عامل قوتیں ہیں جوکارکن ہیں اورجواپنے اثرات سے جانی جاتی ہیں۔ مثلاً گرمی، روشنی اورحرکت عامل قوتیں ہیں اوریہی حال دیگر

صنعتوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشیاء میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اوریہ تبدیلی نہ صرف بیرونی حالت اور خارجی وضع کی تبدیلی ہوتی ہے بلکہ اندرونی تبدیلی بھی ہوتی ہے مثلاً ایک زندہ بدن ہمیشہ تمام وقت بدلتا رہتا ہے۔لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود وہ وہی بدن رہتا ہے اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ چیز ہے جو تمام تبدیلیوں کے درمیان یکساں رہتی ہے، بعض اوقات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ اُس شے کا جوہر اور ذات ہے لیکن جوہر کا تصور محض ایک مجرد ذہنی تصور ہے جس کی تجرید ایک خیالی امر ہے۔

پس کوئی شئے مختلف عامل قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے مادہ کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میدانِ عمل بنارہے، لیکن جیسا ہم اُوپر کہہ چکے ہیں عمل درحقیقت روح کا امتیازی نشان ہے، ان حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ روح اورمادہ میں درحقیقت کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے متضاد سمجھے جائیں ، ان دونوں کے درمیان فی الحقیقت کوئی خلیج حائل نہیں ہے مثلاً جب ہم روٹی کھاتے ہیں توہمارے جسم اس کوہضم کرتے ہیں جس مادہ کی وہ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ہمارے اندرجاکر اپنی صورت تبدیل کرلینا ہے نوالہ ہمارے خون میں جاکر ہمارے زندہ نظام کا حصہ بن جاتا ہے۔ اور اس کے اثر کی حدبندی نہیں کرسکتے، اگر وہ ہماری ہڈیوں اورپٹھوں کے بننے اوراُن کی نشوونمامیں ممدومعاون ہوسکتا ہے۔ توکیا وہ ہمارے خیالات ،جذبات وغیرہ کے بننے اور نشوونما پانے میں میں ممدومعاون نہیں ہوسکتا؟کیا ایک بھوکے فاقوں کے مارے انسان کا دماغ نشوونما پاسکتا ہے؟اوراُس کے ذہن کا عمل ترقی کی اعلیٰ منازل کوطے کرسکتا ہے؟ہرگزنہیں پس روٹی کا نوالہ درحقیقت ایک ہمیشہ تبدیل ہونے والی شے ہے جومختلف صورتیں پکڑتی ہے اورجس کے عمل کی ایک صورت دوسری میں اوردوسری صورت تیسری میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اوریوں علیٰ ہذا القیاس وہ ایک لامتناہی سلسلہ بن جاتا ہے پس اگر جس شے کو ہم مادی کہتے ہیں وہ ایسی صورتیں اختیارکرلیتی ہے جس کو ہم" روحانی" کہتے ہیں۔ توکیا مادی اورروحانی شے میں فرق اورامتیازباقی رہ جاتا ہے؟

(۲-)

مذکورہ بالا امور کو پیش نظر رکھ کر اب جسم کی طرف آئیے۔ہمارا جسم ایک تغیر پذیر شے ہے جس میں ہر وقت تبدیلی وقوع میں آتی رہتی ہے اس کے جوذرات گھس پس جاتے ہیں اُن کی جگہ نئے ذرات لے لیتے ہیں۔ چند سالوں کے بعد (جن کو عرفِ عام میں سات سال کہا جاتا ہے)جسم کے تمام ذراتِ کلیتہ تبدیل ہوجاتے ہیں۔ایسا کہ پُرانا جسم نیست ہوجاتا ہے۔ اوراس کی جگہ ایک نیا جسم لے لیتا ہے سات سال کے بعد یہ نیا جسم بھی پُرانا ہوجاتا ہے اورایک تیسرا نیا جسم اس کی جگہ لے لیتاہے اب سوال یہ پیداہوتا ہے کہ وہ کیا شئے ہے جوجسم کی ان تمام تبدیلیوں میں ہماری انفرادیت کو برقرار اور قائم رکھتی ہے؟ ایک اور مثال لے لیجئے۔دریا کا پانی ہمیشہ بہتا رہتا ہے لیکن اُس کی جغرافیائی صورت قائم رہتی ہے کیا اسی طرح ہمارے جسم کی تبدیلیوں کے درمیان ہماری انفرادیت کی کوئی صورت قائم رہتی ہے؟اگر رہتی ہے توکیا موت کے بعد بھی وہ تبدیلی کے درمیان قائم رہے گی؟موجودہ جسم کی تبدیلیاں اس قدرعظیم ہوتی ہیں کہ اگرکسی شخص نے کسی بچہ کو بچپن کی حالت میں دیکھا ہوتو وہ اس کو بیس پچیس سال کے بعد کبھی پہچان نہیں سکیگا اگرچہ بچہ وہی ہوتاہے جو بچپن سے لڑکپن اورجوانی کی مختلف منازل کو طے کرتارہتاہے پس سوال یہ ہے کہ وہ کیا شئے ہے جوہمارے جسم کی انفرادیت کو قائم رکھتی ہے ؟اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شئے ہماری زندگی کااصل ہے جوتبدیلیوں کے درمیان جسم کی تمام قوتوں کو تنظیمی ترتیب دے کر باقاعدہ طورپر ان کو ایسا مضبوط کرتا ہے کہ اس جمس کی انفرادیت قائم رہتی ہے پس انسانی جسم محض ذرات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ہر جسم کی ترکیب اور ساخت جداگانہ ہوتی ہے جس سے ہم ایک جسم کو دوسرے سے پہچان لیتے ہیں۔ ہر جسم کے ذرات خاص خاص ترکیبوں سےمرکب ہوتے ہیں اورہر جسم کے ذرات اُس قانون کے تحت ہیں جس سے اس کی زندگی کا اصل ان کو باقاعدہ طورپر مرتب کرتا ہے اوراس میں حسب ضرورت ترمیم وتعدیل کرتا رہتا ہے ایساکہ ہمارے جسم ہماری ذہنی اورروحانی حالت کا عکس ہوجاتے ہیں مثلاً بعض لوگوں کی عادتیں ایسی مکروہ

ہوتی ہیں کہ ان کے چہرے اورجسم گھنونے ہوجاتے ہیں مثلاً غصہ ورشخص کا ماتھا اور چہرے کے شکن محبت بھرے شخص کے چہرے سے بالکل مختلف ہوجاتے ہیں مثل مشہور ہے کہ پچیس برس کی عمر کے بعد ہر شخص اپنے چہرے کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے نیک سیرت شخص کا جسم ایک قسم ہوجاتا ہے لیکن بدکار آدمی کا جسم دوسری قسم کا ہوجاتا ہے۔ بہر صورت زندگی کا اصل ہمارے اندر ہر وقت کام کرتا رہتا ہے کیا یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ یہی زندگی کا اصل موت کے بعد بھی کارفرما رہے؟ اورجو بدن بھی ہم کو ملے وہ ہماری شخصیت کے عین مناسب اورہماری روحانی حالت کے عین مطابق ہو؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح تبدیلیوں کے باوجود ہم کسی شخص کے جسم کو پہچان کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی ہے اُسی طرح ہمارے اس جسم اورموت کے بعد کے بدن میں تبدیلی کے باوجود انفرادیت قائم رہے ؟

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ہماری ظاہری صورت کی یہ انفرادیت زندگی کے اصل کی تنظیمی ترتیب کی وجہ سے ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسمانی انفرادیت محض ایک سطحی شے ہے۔ہماری شخصیت یکسانیت محض جسمانی انفرادیت سے بہت زیادہ گہری ہے ہمیں یادرکھنا چاہیے کہ شخصیت کے لئے ذیل کے عناصر ضروری ہیں:

(۱۔) خود شعوری (۲۔) قوتِ ارادی(۳۔) قوتِ حافظہ(۴۔)مخصوص جذباتی عمل، جوہر جداگانہ شخصیت کے لئے جدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی شخص کی حیاتِ جاودانی کا یااُس کی شخصیت کی بقا کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس میں مذکورہ بالا چاروں عنصروں کا قائم اوربرقراررہنا لازمی ہے۔ شائد کوئی یہ خیال کرے کہ آخری عنصر یعنی جذبات کے برقراررہنا لازمی ہے۔ شائد کوئی یہ خیال کرے کہ آخری عنصر یعنی جذبات کے برقراررہنے کی ضرورت نہیں ہے؟لیکن جذبات کے پہیم تواتر اورتسلسل کا جاری رہنا حدود درجہ لازمی ہے کیونکہ یہ پہلو ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہوتا ہے۔ اورہر زندہ نفس کی زندگی کو خصوصی انداز سے ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً محبت اعلیٰ

ترین جذبہ ہے اورآسمانی زندگی درحقیقت محبت کی ہی زندگی ہے۔

(۔۳)

جب ہم رسولوں کے عقیدہ میں اقرارکرتے ہیں کہ " میں بدن کی قیامت پر ایمان رکھتاہوں" توہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس لاش کوہم سپردِ خاک کرتے ہیں یاجلادیتے ہیں۔ وہی قیامت کے روزقبر سے دوبارہ اٹھ کھڑی ہوگی۔ کیونکہ یہ ایک ناممکن اوراَنہونی بات ہے۔ وہ تو خاک کا حصہ ہوجاتی ہے۔ جس کے ذرات خاک کے دوسرے ذرات سے مل کر نئے مرکباب بن جاتے ہیں جوپودوں حیوانوں اور انسانوں کے جسموں کی ترکیب میں شامل ہوکر اُن کے جسمنوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ جیسا ہم اُوپر کہہ چکے ہیں ۔ ہرسات سال کے بعدہم کو ایک نیا جسم مل جاتا ہے۔پس کیا ضرورہے کہ ہم خواہ مخواہ یہ فرض کرلیں کہ ہمارا اس دنیا کا آخری جسم (جس کو ہم دفن کرتے ہیں)ہماری اصلی شخصیت کا حقیقی آئینہ دارتھا۔ اوراُس کے پہلے کے جسم ہماری شخصیت کے اصلی نمائندے نہ تھے؟ سچ تویہ ہے کہ ہمارے بڑھاپے کا جسم انحطا ط اور ضعیفی کے زمانہ کا ہوتاہے، جب ہماری شخصیت کے قواء ایک ایک کرکے سب جواب دینے لگ جاتے ہیں اوروہ جسم ہماری شخصیت کی کاملیت اورشکتی ذہنی قوت اور روحانی طاقت کا کماحقہ اظہارنہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مقدس پولوس نے فرمایاہےکہ" خدا نے جیسا ارادہ کرلیا ویسا ہی اُس کو جسم دیتا ہے"۔

بقا کےلئے لازم ہے کہ ہماری شخصیت کا تواتر اور تسلسل قائم رہے۔ اور تبدیلیوں کے درمیان شخصیت کے مذکورہ بالا عناصر ہمیشہ برقرار ہیں۔ شخصیت کی بقا کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہماری مستقبل زندگی میں یہ استمرار تواتر اورتسلسل ہمیشہ قائم رہے۔ حق تویہ ہے کہ تبدیلی کے مفہوم میں ہی یہ بات داخل ہے کہ جو شے تبدیل ہووہ تبدیلی سے پہلے اورتبدیلی کے بعد وہی شے رہے۔

اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ ہمارا جسم موت کے بعد کس قسم کاہوگا؟ توہم اس سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں دے سکتے ۔ہم فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ لازم ہے کہ موت

کے بعد جوبدن بھی ہم کو ملے وہ ہماری شخصیت (جس میں مذکورہ بالا عناصر شامل ہوں)کا بہترین طورپر اظہار کرسکے۔اس سوال کا جواب ہم دینے سے قاصر ہےکیونکہ موت کی تبدیلی کے بعد کا بدن ہمارے حواس خمسہ کے تجربہ میں نہیں آیا۔ اس سوال کا جواب محض ظن اور قیاس کے ساتھ ہی تعلق رکھتا ہے چنانچہ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اسی دنیا میں موت سے پہلے اپنے موجودہ کثیف جسم کے ساتھ ساتھ ایک اور اندرونی باطنی اور غیر مرئی بدن بھی بناتے جاتے ہیں۔جونہایت لطیف ذرات سے بنا ہوتاہے۔ اوریہ نظریہ غیر ممکن نہیں کیونکہ یہ نظریہ استمرار اور انفرادیت کو برقراررکھتاہے۔ اس کے مطابق روح غیرمرئی دنیا میں بغیرکسی بدن کے داخل نہیں ہوتی۔اوراُسے نئے سرے سےکوئی ایسا بدن بنانا نہیں پڑتا۔ جواسکے مناسب حال ہو۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ اس جہان سے کوچ کرتے وقت بنا بنایا بدن لے جاتی ہے اس نظریہ سے ہم میں موجودہ زندگی کی سنجیدگی کا احساس بھی پیدا ہوجاتاہے۔ کیونکہ ہم یہ جان جاتے ہیں کہ ہمارے موجودہ خیالات ، عادات ، جذبات اور افعال نہ صرف ہمارے موجودہ جسم کو ہی ڈھالتے ہیں بلکہ ہمارے مستقبل بدن کا بھی تانا بانا ہیں۔ جو نادیدہ جہان میں ہماری روح کا ذریعہ اظہاراورآلہ کارہوگا۔بہر حال یہ محض قیاس آرائی ہے جویقینی نہیں ہوسکتی۔

(۴۔)

سائنس نے حیات بعد ازممات کی تحقیق وتفتیش کی ہے ۱۸۸۲ء میں اس مقصد کےلئے ایک باقاعدہ سوسائٹی بنائی گئی جس کا نام Society of Psychical Research ہے۔ گذشتہ ستر سال سے مغربی ممالک اورامریکہ کے ماہرین نفسیات ، علماء اورسائنس دان سائنس کے اصولوں کے مطابق اُن لاتعداد حقائق اور مشاہدات کی کھوج لگاتے رہے ہیں جن کا تعلق قبرکے بعدکی زندگی سے ہے۔ اُن کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہے ۔ کہ آج اس مضمون پر ایک بڑے حجم اور ضخامت کی وسیع لٹریچر موجود ہوگئی ہے۔ جس کے مطالعہ کےلئے سالہاسال درکار ہیں اب یہ سائنس دان مانتے ہیں کہ موجودہ زندگی کا انجام موت نہیں ہے بلکہ زندگی غیرمنقطع اور مسلسل ہے جس میں موت بھی حائل ہوکر

خلل نہیں ڈال سکتی کیونکہ موت اوراس تواتر میں روزانہ نیند کی طرح محض ایک ضمنی واقعہ ہوتی ہے جس میں سے ہر انسان گزرتا ہے۔ جسم روح کا آلہ کاراور ذریعہ اظہار ہے۔ جس کو روح نے اس موجودہ زندگی کے برسوں میں آہستہ آہستہ ترکیب وترتیب دے کے منظم کیا ہے۔ لیکن جب روح اِس موجودہ جسم کی قید سے آزاد ہوجاتی ہے تووہ ایک ایسی زندگی شروع کرتی ہے جس کے میدانِ عمل میں موجودہ دنیا کی سی روکاٹیں حائل نہیں ہوتیں۔ وہ زندگی زیادہ حقیقی اوراُمید افزا حالات کی زندگی ہوتی ہے۔ روح کا نیا بدن زیادہ لطیف ہوتا ہے جو روحانی مقاصد اور اغراض کے حصول کے لئے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔

"مقدسوں کی رفاقت"

مقدسوں کی رفاقت اورمُردوں کے لئے دعا مانگنے کا دستور

گذشتہ مضامین میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب ہم اس دارِفانی سے کوچ کرجاتے ہیں توہم فنا نہیں ہوجاتے بلکہ اسکے برعکس ہماری شخصیت قائم اور برقرار رہتی ہے اورموت سے پہلے کی شخصیت میں اورموت کے بعد کی شخصیت میں تواتر اورتسلسل بعینہ اُسی طرح قائم رہتا ہے جس طرح روزانہ رات کو نیند سے پہلے اورصبح جاگ اٹھنے کے بعد ہماری شخصیت میں کسی قسم کافرق نہیں ہوتا۔

ہم نے ان مضامین میں یہ بتلایا ہے کہ موت کے بعد کی زندگی غشی اوربے ہوشی کی زندگی نہیں ہوتی بلکہ ہماری حالت شعور کی حالت ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو نہ صرف اپنی حالت کا علم ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی شخصیت کا بھی علم ہوتا ہے قبر کی پرلی طرف کے

رہنے والے کو نہ صرف یہ پتہ ہوتا ہے کہ میں وہی قبل ازمرگ والا " میں" ہوں بلکہ اُس کو اِس کے قبل ازمرگ کے رشتے اور تعلقات سب یاد ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کی قوتِ حافظہ، اس کے خیالات ، جذبات اور محبت وعداوت خصلت کیریکٹر وغیرہ سب اس کے ساتھ جاتے ہیں جواُس کی شخصیت کے اجزائے لائینفک ہوتے ہیں۔ پس موت کے بعد ہر شخص اپنی قبل ازمرگ زندگی کے خاندانی اوردیگر تعلقات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اوران کو یادرکھتا ہے کیونکہ اس کے خیالات ، جذبات، روحانی حالات عادات اورکیریکٹر سب وہی ہوتے ہیں جو موت سے پہلے تھے۔ فرق صرف بیرونی اور خارجی حالات میں ہی واقع ہوتا ہے۔ اس موجودہ خارجی دنیا کے عوض وہ ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے" جو مسیح " کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ خداوند کی قربت میں ہوتا ہے اوراسکا ماحول اس دنیا سے بدرجہابہتر ہوتا ہے ،جہاں وہ اپنی سفلی اوربہیمی زندگی اورگندے خیالات، غلیظ جذبات اور بیہودہ عادات پر زیادہ آسانی سے غالب آسکتا ہے۔ اس کی غیر مکمل زندگی کی خامیاں ایک ایک کرکے رخصت ہوسکتی ہیں، حتیٰ کہ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ خدا کے ایک جلال کو روبرو دیکھ سکے(۱کرنتھیوں ۱۳: ۱۲) انسان اپنی موت کے بعد رائی ملک عدم نہیں ہوتا بلکہ راہی ملک انتظار ہوتا ہے۔ اس ملکِ انتظار میں اس کی روح رفتہ رفتہ اس قابل ہوجات ہے کہ " مسیح کے قد کے پورے اندازے" تک پہنچ سکے۔

(۱۔)

پس سوال یہ ہے کہ اگرہمارے عزیز جو اس جہان سے کوچ کرجاتے ہیں اپنے ساتھ وہی خیالات، عادات، جذبات، قوتِ حافظہ اورخصائل وغیرہ لے جاتے ہیں اورپار کی دنیا میں بھی وہ ہم کو یادرکھتے ہیں توہمارے اوراُن کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہوسکتے ہیں؟ کیا اُن میں اورہم میں کسی قسم کی باہمی رفاقت قائم رہ سکتی ہے؟ کیا وہ بدستورسابق ہماری پرواہ کرتے ہیں اورہم سے محبت رکھتے ہیں ؟ کیا وہ ہمارے لئے اُسی طرح دعائیں کرتے ہیں جس طرح وہ قبل ازمرگ اس دنیا میں دعائیں مانگتے تھے؟ کیا ہمارے اوراُن کے باہمی تعلقات اُسی قسم کے ہوتے ہیں جوایسے رشتہ داروں میں ہوتے ہیں جومختلف ممالک میں رہنے کی وجہ سے ایک

دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں؟ انجیل جلیل ان سوالات کا جواب اثبات میں دیتی ہے اورکلیسیائے جامع اس بات پر ایمان رکھتی ہے کہ قبر کے آرپار کے رہنے والے ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں اور جسم کی موت اس رفاقت میں ہرگز خلل انداز نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم " رسولوں کے عقیدہ" میں اقرار کرتے ہیں" میں ایمان رکھتا ہوں روح القدس پر۔ پاک کلیسیائے جامع پر۔ مقدسوں کی رفاقت پر۔۔۔" مقدسوں کی رفاقت کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ تمام مسیحی جو اس دنیا میں بقیدِ حیات ہیں اور وہ تمام مسیحی جو اس دنیا سے کوچ کرکے" ملکِ انتظار" میں ہیں اور وہ تمام مسیحی جو اپنی بُری خصائل پر کامل فتح حاصل کرکے جلالی ملک میں خدا کی قربت میں رہتے ہیں ۔ سب کے سب ایک دوسرے سے رفاقت رکھتے ہیں اور ہر معنی میں ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ کلیسیا کے وہ شرکاء جو اس دنیائے فانی میں روحانی جنگ کررہے ہیں ۔ اورکلیسیا کے وہ شرکاء جو اُس جہان کے ملکِ انتظار میں فتح پر فتح پا رہے ہیں ، اورکلیسیا کے وہ شرکاء جو کامل فتح حاصل کرکے اپنے منجئی کی محبت میں سرشار اوراُس کے نور میں رہتے ہیں سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت ، دعا ہمدردی اورمحبت کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور سب کے سب " مسیح یسوع میں ایک " ہیں۔کیونکہ ان سب کی باہمی رفاقت کا اصل سیدنا مسیح ہے جس کو وہ وہاں اورہم یہاں پیار کرتے ہیں جس کی وہ اورہم تعریف کرتے ۔ عبادت اورپرستش کرتے ہیں"اورجس کی قربت میں ہم سب "ایک " ہیں۔ سیدنا مسیح کی حضوری اس دنیا میں ہمارے ساتھ ویسی ہے جیسی ملکِ انتظار میں رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ وہی "انگور کی حقیقی بیل" ہے اورہم سب اُس کی ڈالیاں ہیں خواہ ہم اس دنیا میں رہیں خواہ قبر کے پار کی دنیا میں رہیں۔اسی ایک درخت کے تنہ سے سب ٹہنیوں کو زندگی ملتی ہے خواہ وہ ٹہنیاں دیوار کے اس طرف ہوں جو نظر آتی ہیں خواہ وہ دیوار کی پرلی طرف ہوں جو نظر نہیں آتیں۔ لیکن جن پر سورج کی روشنی ہردم اورہرلمحہ رہتی ہے (مکاشفات ۲۱: ۲۳) جس طرح ہماری ناکامیوں ، خامیوں اورگناہوں کے باوجود مسیح ہماری زندگی ہے،اُسی طرح (بلکہ اس سے بھی

زیادہ) وہ ہمارے اُن عزیزوں کی زندگی ہے جو ملکِ انتظار میں ہیں۔ جس طرح ہم اس دنیا میں اپنے عزیزوں کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اُسی طرح وہ اپنے عزیزوں کےلئے جن کو وہ اس دارِفانی میں چھوڑگئے ہیں دعائیں کرتے ہیں۔ جس طرح ہم خدا کی حمدوتعریف اورستائش کرتے ہیں، اُسی طرح وہ بھی رب العزت کی ستائش اورتعظیم میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسیائے ہندوپاکستان کی دعائے عمیم کی کتاب میں پاک رفاقت کی نمازمیں ہم خدا کی تعریف کرتے وقت کہتے ہیں۔

" اس لئے فرشتوں، مقرب فرشتوں اورکل آسمانی فوج کے ساتھ ہم تیرے نام کی حمدوتعظیم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ،قدوس ،قدوس ، قدوس خداوند رب الافواج آسمان اور زمین تیرے جلال سے معمورہیں۔۔۔"

بعض اوقات یہ سوال کیا جاتاہے کہ ہمارے عزیز جو اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے ہیں ہمارے لئے کس طرح دعا کرسکتے ہیں ؟ لیکن جب ہم یہ مانتے ہیں کہ وہ " مسیح کے ساتھ" ہیں تویہ سوال فضول اورمہمل سا ہوجاتاہے کیونکہ جہاں مسیح ہے وہاں کی آب وہوا کی فضا دعا کی فضا ہے۔ چنانچہ مقدس یوحنا عارف فرماتاہے:

"ہرایک کے ہاتھ میں بربط اورعود سے بھرے ہوئی سونے کے پیالے تھے۔ یہ مقدسوں کی دعائیں ہیں"(مکاشفہ ۵: ۸۔ ۸ : ۴) جب ملکِ انتظارکی فضا ہی دعا کی فضا ہے توکیا ہمارے وہم وگمان میں یہ آسکتاہے کہ ہماری مائیں اورہمارے عزیز جو اس دنیا میں ہر وقت ہمارے واسطے سربسجود تھے، اُس پارکی دنیا میں ہمیں ایسا فراموش کردیں کہ وہ ہمارے لئے دعا بھی نہ کریں؟ وہ غشی اوربیہوشی کی حالت میں نہیں رہتے۔ بلکہ حالتِ شعورمیں ہیں۔ اوران کی قوتِ حافظہ اور شخصیت ویسی ہی برقرار ہے۔ اندریں حالات وہ ہماری حالت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور ہمارے نیک وبد کرداراورافعال کو نادیدنی نگاہوں سے غیر مرئی دنیا سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم کوآزمائشوں پرفتح پاتے یااُن پر گرتے دیکھتے ہیں ۔ کیا یہ ممکن ہوسکتاہے کہ وہ ان باتوں کودیکھتے ہوئے ہمارے لئے بارگاہِ ایزدی سے دعا نہ کرتے ہوں"؟ وہ مسیح کے ساتھ" ہیں۔ گوہم کو"دھندلا" سا دکھائی

دیتا ہے ۔ لیکن وہ سب امور کو "پورے طور پر پہچانتے ہیں" اور "روبرو" دیکھتے ہیں (۱کرنتھیوں ۱۳: ۱۲۔)پس وہ اپنے گم گشتہ عزیز و اقارب کے لئے آہیں بھر کر اور کراہ کر دعائیں کرتے ہیں تاکہ وہ مسیح کے رفیق ہوکر اس دنیا میں ایسی زندگی بسر کریں کہ وہ مقدسوں کی رفاقت میں قائم رہیں۔

(۲۔)

پس جب ہم اس دارِ فانی میں ہیں، اورہمارے عزیز جواُس پار ملکِ انتظار میں رہتے ہیں مسیح کی رفاقت میں قائم ہیں ، تویہ واجب اور لازم ہے کہ جس طرح وہ ہماری آزمائشوں کے وقت ہمارے لئے دعا کرتے ہیں ہم بھی اُن کے لئے دعا کیا کریں۔ تاکہ وہ ملکِ انتظار سے گذر کر اُس جلالی نور میں داخل ہوں جہاں آفتابِ صداقت اپنی پوری درخشانی کے ساتھ چمکتا ہے (مکاشفہ ۲۱: ۲۳) لفظ "رفاقت" کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم دونوں میں باہمی تعلقات قائم ہیں۔ ورنہ یہ لفظ بے معنی رہ جاتا ہے۔ رفیق کے لفظ کا اطلاق اُن پر کیا جاتا ہے جوایک دوسرے کے ساتھی ہوں جو ایک دوسرے کو یادرکھیں اورایک دوسرے سے محبت کریں۔ اورایک دوسرے کا سہارا ہوکر آڑے وقت میں مدد کریں۔ پس لازم ہے کہ جس طرح اُس پار ملکِ انتظار اورملکِ نور کے رہنے والے ہمارے لئے دعائیں اورمناجاتیں کرتے ہیں ہم بھی اُن کے لئے دعائیں اورمناجاتیں کریں۔تاکہ وہ روزانہ خدا کی قربت اورمحبت میں بڑھتے جائیں اوراپنی خامیوں سے (جو وہ اس دنیا سے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں)زیادہ کامل طور پر رہائی حاصل کرکے فضل اورپاکیزگی سے معمور ہوجائیں۔ پس جس طرح ہم اُن کی دعاؤں کے محتاج ہیں وہ بھی ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں جس طرح اُن کی دعائیں ہماری روحانی زندگی میں مدد کرسکتی ہیں۔اُسی طرح ہماری دعائیں بھی اُن کی روحانی ترقی میں ممدومعاون ہوسکتی ہیں۔

(۳۔)

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کلیسیائے جامع پہلی پندرہ صدیوں تک اپنے عزیزوں کیلئے دعائیں کرتی چلی آئی جس طرح وہ ابتداء سے ہر زمانہ میں کرتی چلی آئی ہے۔ پس کلیسیائے ہندوستان وپاکستان کے شرکاء پر لازم ہے کہ وہ اس قدیم روایت کو قائم رکھ کر اپنے اُن عزیزوں کے لئے جو اُس پار ملکِ

انتظار میں رہتے ہیں ،خدا کے فضل کے تخت کے حضور ہمیشہ دعائیں کیا کریں۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ گذشتہ چار صدیوں سے یورپین ممالک کی " اصلاح یافتہ" کلیسیاؤ ں نے اس دلکش روایت اور قدیم دستور کو بند کردیا ہے۔ اس کی وجہ رومی کلیسیا کی بعض بد عنوانیاں تھیں ، جن کی وجہ سے عاشقانِ مسیح اس کلیسیا سے بیزار ہوگئے تھے۔کلیسیائے روم نے مُردوں کےلئے دعائیں کرنا تجارت کا ذریعہ بنارکھا تھا جس سے اُس کی آمدنی میں بڑا بھاری اضافہ ہوگیا تھا ۔ لیکن یورپ کے مصلحین نے اس خرابی کی اصلاح کرنے کی بجائے اس کو کلیتہً بند کردیا۔واجب تو یہ تھا کہ مصلحین اس بات پر زور دیتے کہ دعاؤں کو آمدنی کا ذریعہ نہ بنایا جائے اوراس کا ناجائز استعمال نہ کیا جائے۔ اس کی بجائے اُنہوں نے اس کے جائز استعمال کو بھی حکماً بند کردیا۔ اوررفتہ رفتہ ان اصلاح یافتہ کلیسیاؤں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ مُردوں کےلئے دعا مانگنا ایک قبیح بات ہے۔اورچونکہ پنجاب کے مسیحی کسی نہ کسی " اصلاح یافتہ کلیسیا" کے ممبر ہیں وہ بھی اس غلط خیال میں مبتلا ہوگئے۔کہ مُردوں کےلئے دعا مانگنا ایک بدعتی عقیدہ ہے ۔حالانکہ یہ تمام راسخ الاعتقاد کلیسیاؤں کا عقیدہ ہے اورکلیسیائے جامع اپنے عزیزوں کےلئے دعائیں کرتی چلی آئی ہے ۔حق تو یہ ہے کہ اُن کےلئے دعا نہ کرنا بدعت ہے۔

یورپین ممالک کی کلیسیائے روم اوراصلاح یافتہ کلیسیاؤں میں باہمی مخاصمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اصلاح یافتہ کلیسیائیں کلیسیائے جامع کے اُن تمام دستورات اوررسومات کو ترک کردیتی تھیں جن کا رومی کلیسیا میں رواج تھا۔ مثلاً رومی کلیسیا کے خادمانِ دین نماز پڑھتے وقت عبادت عمیم کی کتابوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پس اصلاح یافتہ کلیسیاؤں نے تحریری کتابی دعاؤں کا استعمال ترک کرکے زبانی دعاؤں کا رواج شروع کردیا۔ کلیسیائے روم کے خادمانِ دین عبادت کے وقت خاص لباس زیب تن کرتے ہیں۔ پس ان کلیسیاؤں نے اس کو بھی خیرباد کہہ دیا۔رومی کلیسیا اس بات پر زور دیتی ہے کہ عبادت کےدوران میں دعا کرنے کے وقت گھٹنے ٹیکے جائیں۔ پس ان کلیسیاؤں نے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے دعا کے وقت بیٹھنے کی رسم شروع کردی۔ حتیٰ

کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب پیوری ٹن (Puritan) اپنے مُردوں کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر گاڑدیتے تھے۔ کیونکہ رومی کلیسیا جنازہ کی نمازپڑھتی تھی[1]۔

اسی قسم کے جذبات کے ماتحت اصلاح یافتہ کلیسیاؤں نے اپنے مرُدہ عزیزو اقارب کےلئے دعا کرنے کے قدیم دستور کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ اورنماز جنازہ کے بعدجماعتی اورخاندانی دعاؤں میں مُردوں کا نام لینا بھی گناہ متصور ہوگیا۔ اسی بات کی تعلیم ہندوستان اورپاکستان کی مختلف کلیسیاؤں کو دی گئی ہے جس کانتیجہ یہ ہے کہ فردوس کے رہنے والے ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہوگئے ہیں۔ اورموت کے بعد اُن کی یاد تھی حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے۔

کلیسیائے ہندوپاکستان کے شرکاء پر واجب ہے۔ کہ وہ بھی کلیسیائے جامع کے دستورِقدیم کو پیش نظررکھ کر اپنے ان عزیزواقارب کو اُسی طرح خدا کے فضل کے تخت کے حضوریادکیا کریں جس طرح وہ اُن کو اُس زمانہ میں یاد کرتے تھے۔ جب وہ اُس دارِفانی میں موجود تھے تاکہ غیرمرئی دنیا ہمارے لئے ایک حقیقت ہوجائے۔

----

[1] The Prayer Book (Church Series) by Rev.Percy Dramer